انگارے
مؤلفہ
ڈاکٹر خالد علوی

انگارے

انگارے

ڈاکٹر خالد علوی

تقسیم کار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

ANGARE

by

Dr. Khalid Alvi

Year of Edition 2013

Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	انگارے
مصنّف	:	ڈاکٹر خالد علوی
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۳ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مطبع		عفیف پرنٹرس، دہلی ۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

پروفیسر عبدالحق کے نام

ہدیہ از بے نوائے ہم پذیر

(اقبال)

فہرست

☆☆

پیش گفت

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ جدید افسانہ کا نقطۂ آغاز ''انگارے'' سے ہوتا ہے۔ آج اُردو افسانہ نہایت متنوع اور باثروت ہے لیکن ''انگارے'' کی اشاعت سے قبل پریم چند کے علاوہ کوئی دوسرا اہم نام ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو افسانوی ادب کے تناظر میں اگر ''انگارے'' کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی ادبی قدر و قیمت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے آج اُن کی حیثیت محض تاریخی ہو کر رہ گئی ہے۔

بقول احمد ندیم قاسمی ''انگارے'' کا ادبی معیار کچھ بھی ہو مگر مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا وہ مجموعہ ہے جس نے نہ صرف افسانے کی دنیا بلکہ تخلیقِ فن کی جملہ اصناف میں انقلاب برپا کر دیا تھا جو ایک مختصر عرصے کے بعد ترقی پسند ادب کی تحریک کی صورت میں برصغیر کے ہر چہار طرف رواں ہو گیا۔

اُردو افسانے کے نشو و نما، رجحانات کے سلسلے میں ''انگارے'' کا بے محابا اور بے تحاشا حوالہ ادب کے طالب علموں میں ایک تجسّس جگاتا ہے۔ ''انگارے'' کی اشاعتِ ثانی کے پسِ پشت وہی تجسّس کارفرما ہے۔ مجھے ''انگارے'' کا مطالعہ کرنے کے لئے زرِکثیر خرچ کر کے انڈیا آفس (لندن) سے مائیکروفلم برآمد کرنی پڑی۔ ہندستان کی کسی لائبریری میں ''انگارے'' کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔

تقریباً دس سال قبل جب مَیں نے دہلی یونیورسٹی میں ایم فِل میں داخلہ لیا تھا تو ''انگارے'' کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کرنے کا قصد کیا۔ لیکن کتابت ہو جانے کے

بعد بھی شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ اِس درمیان میرے نظریات میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اپنے مقدمے میں بھی جگہ جگہ ترمیم واضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ممکن نہ ہوسکا۔ البتہ اپنے حقوق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے افسانوں میں بعض جملوں کو حذف کردیا ہے تاکہ کسی کی دلآزاری نہ ہو۔

اِس اثنا میں پاکستان میں ''انگارے'' کی اشاعت کی خبرملی۔ لندن میں انڈیا آفس کی افسر محترمہ شبانہ محمود نے بھی ''انگارے'' کا ایک خوبصورت ایڈیشن سویڈن سے شائع کیا ہے۔

اس سلسلے میں ذاکر حسین لائبریری (جامعہ)، تین مورتی لائبریری، لکھنؤ کلکٹر آفس، اور لکھنؤ کی بعض لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا ان کا شکریہ واجب ہے۔

سویڈش اسکالر اور میرے بے تکلف دوست ہنرک نے انڈیا آفس سے لاتعداد کاغذات مہیا کیے لیکن اُن کا شکریہ اس لیے بھی رسمی ہے کہ ان تک کبھی نہ پہنچے گا۔

پروفیسر عبدالحق، صدر شعبۂ اُردو، ایم فِل اور پی۔ ایچ۔ ڈی میں میرے نگراں رہے ہیں لیکن اس رسمی تعلق سے قطع نظر اُن کی شفیق شخصیت نے مخلصانہ عنایتوں اور نوازشوں کا ایسا حصار تعمیر کردیا ہے جس سے رہائی ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ کتاب اُن کی ہی نذر ہے۔

بساط رنگ ہے مٹھی میں اس کی
قدم اس کا بشارت کی طرح ہے

ڈاکٹر خالد علوی

اے۔ ۲۹۵، ڈیفنس کالونی
نئی دہلی

☆☆

"انگارے" کا تاریخی پس منظر

تقریباً نصف صدی قبل "انگارے" کی اشاعت محض چند افسانوں کے ایک مجموعے کی اشاعت نہ تھی بلکہ فرسودہ روایات اور رسمی قیود سے بغاوت کا مہذب اظہار تھی۔ ایک نئے "عہدنامے" کا اعلان تھی۔ پروفیسر قمر رئیس کے لفظوں میں یہ ایک ایسی ادبی واردات ہے جس نے آگے چل کر پورے افسانوی ادب کو متاثر کیا۔ نو کہانیوں اور ایک ڈرامے کے مختصر سے مجموعے نے نہ صرف اردو افسانہ نگاری کا رخ بدل دیا بلکہ تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ روایت ایک نیا سنگ میل ثابت ہوئی لیکن نئی نسل کو "انگارے" کی اہمیت کا مکمل احساس وادراک نہیں ہے۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے کہ 'انگارے' کی اشاعت کے تین ماہ بعد یہ مجموعہ ضبط کر لیا گیا تھا اور ناشر کے پاس جو نسخے بچے وہ جلا دیے گئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ "انگارے" اردو کی سب سے زیادہ مذکورہ اور محور کتاب ہونے کے باوجود قاری کی دسترس سے دور ہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد بھی کسی کو "انگارے" کی اشاعتِ ثانی کا خیال نہ آیا۔ فرمان فتحپوری[1] کی روایت کے مطابق تقسیم ہند کے بعد یہ مجموعہ پاکستان سے شائع کیا گیا تھا، لیکن اب نا پید ہے۔ "انگارے" کا پہلا باقاعدہ اور تفصیلی تعارف پروفیسر قمر رئیس کے مضمون "اردو افسانے میں انگارے کی روایت"[2] سے ہوتا ہے۔ "انگارے" پر یہ اولین مبسوط تنقیدی مضمون ہے۔ اگرچہ اس سے قبل مولوی

---

[1] 'افسانہ اور افسانہ نگار' فرمان فتحپوری، ص۱۲۱

[2] 'تنقیدی تناظر' پروفیسر قمر رئیس، ص۶۵

عبدالحق کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدہ "اردو"۔ اورنگ آباد میں "نقاد" کے قلمی نام سے اختر حسین رائے پوری کا پندرہ صفحات کا طویل تبصرہ[1]، "زمانہ" کانپور میں منشی دیانرائن نگم کا مختصر سا تبصرہ[2] اور "جامعہ" دہلی میں 'م' کے قلمی نام سے پروفیسر مجیب کا تین صفحات کا تبصرہ شائع ہوا۔ لیکن مخالفتوں کے طوفان میں یہ معتبر آوازیں بھی دب کر رہ گئیں۔

"انگارے" کے منظر عام پر آتے ہی اردو کے زیادہ تر اخبارات و رسائل نے "انگارے" کے خلاف مضامین شائع کیے۔ ان افسانوں کو خلاف مذہب اور فحش قرار دیا اور کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا۔ حافظ مولوی ہدایت حسین ممبر یو۔ پی کونسل نے گورنر کی کونسل میں "انگارے" کے خلاف آواز اٹھائی اور کتاب کو فحش اور ایک خاص فرقہ کے لیے دلآزار ثابت کیا۔

جن اخبارات نے "انگارے" کے خلاف مضامین لکھے وہ حسب ذیل ہیں:۔

ہفت روزہ 'سچ'، لکھنؤ۔ سہ روزہ 'سرفراز'، لکھنؤ۔ 'راستی'، بارہ بنکی۔ 'ہمدم'، لکھنؤ۔ 'نوید'، لکھنؤ۔ روزنامہ 'خلافت'، لکھنؤ۔ 'آزاد'، لاہور۔ 'رہبر دکن'، حیدرآباد۔ 'شیرازہ'، بارہ بنکی۔ 'مجز عالم'، مرادآباد۔ روزنامہ 'حقیقت'، لکھنؤ۔ ایک انگریزی روزنامہ 'اسٹار' الہ آباد نے بھی "انگارے" کو قابل مذمت تخلیق قرار دیا[3]۔ روزنامہ "حقیقت" لکھنؤ نے اگرچہ "انگارے" کے خلاف ایک مختصر سا نوٹ لکھا لیکن ایماندارانہ صحافت کا حق ادا کرتے ہوئے "انگارے" کی حمایت میں ایک مراسلہ شائع کیا[4]۔ مراسلہ نگار نے اپیل کی تھی کہ "انگارے" کو محض فنی نقطۂ نظر سے پرکھنا چاہیے اور مذہب کو ادب سے دور رکھنا چاہیے۔ لیکن اس اپیل کا خاطر

---

[1] 'اردو' اورنگ آباد۔ اپریل ۱۹۳۳ء، ص۴۱۳

[2] 'زمانہ' کانپور۔ مئی ۱۹۳۳ء، ص۳۳

[3] روزنامہ 'اسٹار' الہ آباد۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء

[4] روزنامہ 'حقیقت'، لکھنؤ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۳۳ء

خواہ اثر نہ ہوا اور اس مراسلے کے جواب میں اسی روزنامہ میں ایک نہایت سخت مراسلہ شائع کرایا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ "مدینہ" بجنور اور "نگار" لکھنؤ نے بھی مخالفانہ اداریے لکھے[۱] لیکن "مدینہ" بجنور کے اداریوں کے علاوہ "نگار" کی فائلوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد بھی مجھے "انگارے" کی مخالفت میں کوئی مضمون دستیاب نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں سہ روزہ "مدینہ" بجنور کے مدیر اعلیٰ حامد اللہ انصاری غازی اور نائب مدیر ملک نصر اللہ خاں عزیز تھے۔ نیاز فتحپوری نے "انگارے" کے سلسلے میں براہ راست کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن کسی دوست کے نام خط میں غالباً اسی جانب اشارے کیے[۲]

"اب ہماری اور آپ کی افسانہ نگاری کا دور ختم ہوا۔ پچھلے چند سالوں کے اندر اندر جو انقلاب اس فن کے اندر ہوا ہے اس کو سنبھالنے کے لیے جس آزادروی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے، وہ ہمیں آپ کو نصیب نہیں۔ اس سے قبل افسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا۔ لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا جس کے لیے محض فرصت درکار تھی۔ اور اب معاملہ حقائق کا ہے جس کے لیے خاک چھاننا ضروری ہے۔"

سہ روزہ "سرفراز" لکھنؤ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "سچ" لکھنؤ سے "انگارے" کے خلاف معاندانہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ سہ روزہ "سرفراز" لکھنؤ شیعہ فرقہ کا ترجمان تھا۔ اس میں زیادہ تر شیعہ علماء اور شیعہ اوقاف کے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔

"سرفراز" کے مدیر اعلیٰ کوئی مجہول الاسم خواجہ اسد اللہ اسد اور مدیر سید مصطفےٰ حسین رضوی تھے۔ اس اخبار کی سیاسی و سماجی بصیرت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک خبر کا حوالہ

۱۔ 'اردو ادب کی تحریکیں'، ڈاکٹر انور سدید، ص ۴۸۵

۲۔ بحوالہ مختصر افسانے کا ارتقا۔ جمال آرا نظامی ص ۶۷

دینا کافی ہے۔ فروری ۱۹۳۲ء کے ایک شمارے میں خبر شائع ہوئی کہ برنارڈ شا نے پیشین گوئی کی ہے کہ سو سال میں تمام یورپ مسلمان ہو جائے گا۔ ایک سال بعد معمولی ردوبدل کے ساتھ اس خبر کی پھر تجدید کی گئی[1] "برنارڈ شا کے تازہ خیالات" کے عنوان سے خبر نما مضمون شائع کیا گیا کہ برنارڈ شا نے پیشین گوئی کی تھی کہ یورپ سو سال میں مسلمان ہو جائے گا لیکن مسلمانوں کی بے حسی پر حیف ہے کہ اس سلسلے میں قطعی بیدار نہیں ہیں۔

"انگارے" کی مخالفت میں اولین مضمون ۲۵ر جنوری ۱۹۳۳ء کے "سرفراز" میں شائع ہوا[2] جس کا عنوان تھا "دنیائے مذہب میں ایک فتنہ"۔ یکم فروری ۳۳ء میں "انگارے کی اخلاقی حیثیت"[3] کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا، جس کے مطابق "انگارے" مخرب اخلاق کتاب تھی۔ ۱۳ر فروری ۳۳ء کی "سرفراز" کی اشاعت میں "انگارے"[4] کے عنوان سے مولوی محمد علی صاحب فاضل کامونپوری کا مضمون شائع کیا گیا۔ ۲۱ر فروری ۱۹۳۳ء کے "سرفراز" میں عبدالحمید خاں صاحب حنفی کا مضمون[5] "راجپال کی روح" شائع ہوا جس میں سجاد ظہیر کا نام لیے بغیر ان کو راجپال اور رنگیلا رسول کے مصنف کی روح قرار دیا گیا۔

۲۵ر فروری ۱۹۳۳ء کے شمارے میں اداریے کے مقام پر کسی غیر معروف شاعر کی نظم شائع کی گئی[6]

---

[1] سہ روزہ "سرفراز" لکھنؤ۔ ۱۷ر فروری ۱۹۳۳ء۔
[2] " " " ۲۵ر جنوری ۱۹۳۳ء
[3] " " " یکم فروری ۱۹۳۳ء
[4] " " " ۱۳ر فروری ۱۹۳۳ء
[5] " " " ۲۱ر فروری ۱۹۳۳ء
[6] " " " ۲۵ر فروری ۱۹۳۳ء

لگادی آگ انگارے نے دنیائے شریعت میں

اے تڑپانے والے روحِ پیغمبر کو تُربت میں
لگادی آگ انگارے نے دنیائے شریعت میں
اُڑائیں کس خطا پر دین حق کی دھجّیاں تونے
دیا تھا دخل کیا اس نے تری لامذہبیت میں
اے عقبیٰ فروشی آج پی لے جتنا جی چاہے
خدا کو منہ دکھانا ہوگا فردا کے قیامت میں
کیا ہے ختم استیصال نخل ملّت بیضا
جسے شبیر نے سینچا تھا خوں سے دشت غربت میں
اسی رفتار پر اس ذات سے دعوائے ہمنامی
پھرا جو بیڑیاں پہنے ہوئے دیں کی حمایت میں
ولایت سے نکل کر شیطنت کے پوجنے والے
خدا معلوم حصّہ کیوں لیا آدم کی طینت میں
یہی معیار ہے کیا مادّی دورِ ترقی کا
بنے زندہ مُرقّع شرک کا اظہار بدعت میں
اجازت ہو تو پوچھوں تیرے دعوائے سیادت سے
یہ اقدام اے معاذاللہ دیں کی ہتک وحرمت میں
امام منتظر میرا اگر غائب نہ ہوجاتا
نہ بڑھتے ہاتھ کیا معصومیت کے قتل وغارت میں
جہاں میں کرکے شائع ننگ ہستی پانچ افسانے[۱]
لگائے چار چاند اسلام ماضی کی شرافت میں

---

[۱] "انگارے" میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے شامل تھے۔

معزز خانداں کے فردِ لائق آج تو تجھ کو
بجانا چاہیے تھا دین کا ڈنکا ولایت میں
بدل سکتا ہے یہ توبہ شکن دَورِ عمل اب بھی
دکھا دے اپنی ہستی کو مٹا کر دردِ ملت میں

۲۷ فروری ۱۹۳۳ء کو صوبہ متحدہ کی کونسل میں حافظ ہدایت حسین بار ایٹ لا نے کونسل میں "انگارے" کو ضبط کیے جانے کا مطالبہ کیا۔[۱] جس کے جواب میں نواب سر احمد سعید خاں ہوم ممبر نے یقین دلایا کہ حکومت جلد ہی "انگارے" کے خلاف کارروائی کرے گی۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء کو ہی سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے نظامی پریس کے مالک علی جوّاد صاحب کو عدالت میں بلایا اور بیان لیا۔ اپنے بیان میں علی جواد صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے حلفیہ بیان دیا جس میں انھوں نے کہا کہ ان کی لاعلمی کی بنا پر مذہبی لوگوں کی دلآزاری ہوئی ہے جس کے لیے وہ معذرت خواہ ہیں۔[۲] علی جواد صاحب نے کتاب کی تمام کاپیاں سٹی مجسٹریٹ کے دفتر میں بھیجدیں۔ جہاں ان کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

الہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار "اسٹار" نے بھی "انگارے" کی مذمت میں مختصر سا مضمون قلم بند کیا۔[۳] "اسٹار" کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں کوئی انگریزی اخبار ایسا نہیں تھا جس نے "انگارے" کی مذمت میں آواز اُٹھائی ہو۔ ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی، اسٹیٹس مین کلکتہ، پائینر لکھنؤ اور لیڈر الہ آباد نے بلا تبصرہ کیے "انگارے" سے متعلق خبریں شائع کیں۔ "لیڈر" الہ آباد میں کتاب ضبط ہونے کے بعد کتاب میں شامل ایک افسانہ نگار محمود الظفر کا دو کالمی مزاحمتی مضمون[۴] SHALL WE SUBMIT

۱؎ سہ روزہ "سرفراز" لکھنؤ۔ ۲۸ فروری ۱۹۳۳ء
۲؎ علی جواد کا حلف نامہ۔ رجسٹر نمبر الف/۲۰۔ کارروائی سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ۔ ۱۹۳۳ء
۳؎ "اسٹار" الہ آباد۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء
۴؎ "لیڈر" الہ آباد۔ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء، ص ۹

"TO GAGGING" شائع کیا۔

"سرفراز" لکھنؤ نے "انگارے" پر تقریباً نو مضامین شائع کیے۔ کچھ مضامین طبع زاد تھے، کچھ "انگارے" پر معاصرین کرام کا تبصرہ" کے عنوان سے ہمعصر اخبارات "سچ" لکھنؤ "راستی" بارہ بنکی اور "اسٹار" الہ آباد کے تبصروں کا حوالہ دیتے ہوئے مضامین شائع کیے۔ لیکن "سرفراز" لکھنؤ بہت معمولی درجہ کا اخبار تھا اور بے حد غیر اہم صحافیوں کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس لیے ان مضامین کو چنداں اہمیت نہ دی گئی۔ لیکن ان مضامین کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے اہل قلم متوجہ ہو گئے۔ "سرفراز" لکھنؤ میں "انگارے" کے خلاف طبع زاد مضامین کا سلسلہ ۱۲ر فروری ۱۹۳۳ء کو "راجپال کی روح"[1] کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "سچ" میں یہ سلسلہ ۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء کو شروع کیا گیا۔ اس کے بعد سات شماروں میں "انگارے" اور "انگارے" کے مصنفین کی مذمت میں مضامین شائع کیے گئے۔ پہلا مضمون "ایک شرمناک کتاب" کے نام سے شائع کیا گیا۔[2]

"لکھنؤ کے ایک شیعہ نوجوان اور ایک رفیقہ اور دو رفیقوں کے نام سے ایک مختصر سا مجموعہ چند افسانوں کا حال میں شائع ہوا ہے۔ زبان بازاری اور گندی اور طرزِ بیان بالکل ہی عامیانہ و متبذل۔ جا بجا مذہب پر بھی اسی قسم کی بازاری پھبتیاں ہیں۔ کوئی ادبی حسن تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا۔ البتہ زبان و انشا کی موٹی موٹی غلطیاں بکثرت۔ کتاب اس قابل بھی نہیں کہ شریفوں کے مجمع میں اس کا نام لیا جائے۔ مذہب پر حملوں کو دیکھ کر سب سے پہلے لکھنؤ ہی کے ایک شیعہ اخبار "سرفراز" نے پُر زور احتجاج کیا اور مقامِ مسرت ہے کہ صاحب مطبع نے فوراً ہی اپنی غلطی و غفلت کا اعتراف کر لیا۔ لیکن نو عمر مصنف (جو

---

[1] 'راجپال کی روح'، عبدالمجید خاں حنفی۔ 'سرفراز' لکھنؤ۔ ۱۲ر فروری ۱۹۳۳ء ص۳

[2] "سچ" لکھنؤ۔ ۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء ص۳

پبلشر بھی ہیں)، شاید ہندوستان سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ لکھنؤ میں کتاب کے خلاف اچھی خاصی برہمی پھیل چکی ہے اور عجب نہیں کہ ان سطور کے شائع ہونے تک مظاہرے بھی شروع ہو جائیں۔ برہمی اب شیعہ جماعت تک محدود نہیں رہی، باہر کے اخبارات میں بھی خلاف لکھا جا رہا ہے، "معارف" لکھ رہا ہے اور لکھنؤ کے اخبارات میں بھی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ مطالبہ یہ ہے کتاب مذہبی حیثیت سے نہایت دلآزار ہے، اس لیے ضبط ہو جانی چاہیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہبی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کتاب اخلاقی حیثیت سے بہت گندی اور گھناؤنی ہے۔ مذہب پر حملے تو کہیں کہیں ضمناً آگئے ہیں لیکن شرافت تہذیب واخلاق، پر حملے تو مسلسل اوّل سے آخر تک ہیں۔ اور کسی مذاق سلیم رکھنے والے کے لیے بھی، خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں، کتاب کا مطالعہ آسان نہیں ہے۔ تعزیراتِ ہند میں ایک دفعہ فحش نگاری سے بھی تو متعلق ہے۔ اگر ایسی گندی کتاب بھی اس دفعہ کے تحت میں نہیں آسکتی، تو خود وہ قانون قابلِ ترمیم ہے۔ کتاب کی ضبطی کا مطالبہ یقیناً صوبہ کی حکومت سے جاری رکھنا چاہیے لیکن بجائے مذہبی دلآزاری، عریاں نگاری و فحش پروری کے تحت میں۔ نوعمر مصنف کا خاندان، سادات کرام کا ایک مشہور و معزز خاندان ہے مصنف کے والد[۵۱] صوبہ اودھ کے سب سے اعلیٰ عہدیدار ہیں اور مصنف کے بڑے بھائی[۵۲] صوبہ کونسل کے ممبر، شہر کے میونسپل کمشنر اور اودھ کے شاید سب سے کامیاب بیرسٹر۔ ان ارکان خاندان کے دلوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی، اس کا اندازہ ہر شریف انسان اپنی حالت پر قیاس کر کے کر سکتا ہے۔ یہ بے چارے اس وقت قابلِ ہمدردی ہیں نہ کہ موجب لعن وطعن۔ بُری صحبتیں آخر کار شریف سے شریف خاندانوں کو بدنام کر کے ہی رہتی ہیں۔ انا اللہ"

---

۵۱ سر وزیر حسن۔

۵۲ سید علی ظہیر۔ جو آزادی کے بعد اتر پردیش میں وزیر قانون ہوئے۔

یہ مضمون مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب کا نتیجۂ فکر تھا مضمون میں مولانا نے زور دیا ہے کہ کتاب مذہبی حیثیت سے دلآزار ہی نہیں ہے بلکہ عریاں نگاری کے ضمن میں قابل ضبطی بھی ہے۔ چوں کہ کتاب میں شرافت، تہذیب واخلاق پر حملے کیے گئے ہیں اس لیے اخلاق اور تہذیب کے مالکان و ذمہ داران کا فرض ہے کہ کتاب کی مذمت کریں، مولانا نے مضمون کی ابتدا میں بتایا ہے کہ لکھنؤ کے ایک شیعہ نوجوان کے افسانے بھی اس میں شامل ہیں۔ آخر میں سروزیرحسن اور سید علی ظہیر کے نام لیے بغیر ہمدردی ظاہر کی گئی ہے۔ مضمون میں التزام رکھا گیا ہے کہ کہیں بھی مصنف اور کتاب کا نام ظاہر نہ ہونے پائے۔

۳ مارچ ۱۹۳۳ء کا "سچ" کا شمارہ اِس کتاب کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔ لیکن ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء کے شمارے میں پھر "ایک شرمناک کتاب" کا عنوان نظر آتا ہے[1]۔

"ایک شرمناک کتاب" پر جو نوٹ شمارہ، پر نکلا اس کے بعد "حقیقت" میں "حق" وغیرہ چند اور اخبارات میں بھی اس کتاب پر مضامین نکلے اور متعدد مقامات پر برہمی کے جلسے ہوئے۔ یہاں تک کہ صوبہ کونسل میں حافظ ہدایت حسین صاحب نے اس کی ضبطی سے متعلق سوال بھی کر دیا۔ "سچ" کے اس نوٹ کو پڑھ کر ایک اہل قلم "سچ" کے کرمفرما لکھتے ہیں:۔

"(مصنف) کی شخصیت، ان کی انشا پردازی، ان کی اصابت — کسی چیز سے بھی قوم واقف نہ تھی، نہ کتاب شائع ہونے سے پیشتر نہ کتاب شائع ہونے کے بعد۔ زیادہ سے زیادہ ان کی کتاب چند سو نکلتی۔ لوگ صفحہ ڈیڑھ صفحہ دیکھتے، خود ہی بند کر کے رکھ دیتے، اس لیے کہ وہ صرف غیر معروف نا قابل توجہ شخص کے افسانوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی سوقیت اتنی عام ہے کہ غالباً کوئی بھی اس طرف توجہ نہ کرتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا مصنف کا مقصد حاصل ہو گیا۔ انھیں سب جان گئے۔ ان کی کتاب کا پریس میں اتنا

---

[1] "سچ" لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء ص۲

چرچا ہوا کہ اگر وہ ہزاروں روپیہ اشتہار پر صرف کر دیتے جب بھی نہ ہو پاتا۔ یہی انھیں چاہیے تھا، یہی انھوں نے پا لیا۔ افسوس جو چیز محدود تھی وہ عام ہو گئی۔ مشتاق نگاہوں سے دیکھی جانے لگی۔ ان کی کتاب پر اسلامی پریس نے جو احتجاج کیا اس پر میری حقیر رائے تھی جو میں نے مؤدبانہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔ آپ کے مکتوب گرامی سے میں نے خیال کیا تھا کہ آپ نے انھیں ناقابل التفات سمجھ کر "سچ" میں ان کا تذکرہ نہ فرمائیں گے۔ سر...... کے صاحب زادے ہیں اس لیے بعض حلقوں میں بار بھی پا جاتے ہیں۔ ورنہ ان کا اصل مقام تو وہ تھا جہاں لکھنؤ کے آوارہ گرد گھوما کرتے ہیں۔ وہی زبان، وہی طرز ادا، وہی پستیٔ خیال، وہی سوقیانہ اور عامیانہ استدلال۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے فن کے اعتبار سے بھی حد درجہ لغو اور مہمل ہیں۔"

مراسلہ نگار نے جو رائے ظاہر کی ہے بالکل صحیح ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مصنف کی شخصیت بجز رسالہ 'جامعہ' کے صفحات کے ساری دنیا کے لیے غیر معروف و گمنام ہے۔ مدیر "سچ" کو ابتداً قلم اٹھانے میں اسی لیے تامل رہا۔ لیکن اس اثنا میں یہ چیز عام ہو چکی تھی اور جس چیز کا اندیشہ تھا وہ واقعہ بن چکا تھا۔ اب خاموشی کے کوئی معنی نہ تھے اس لیے لکھنا ناگزیر ہو گیا۔ پھر بھی اس انداز سے لکھا گیا کہ نہ مصنف کا، نہ تصنیف کا، کسی کا بھی اشتہار نہ ہونے پایا۔ بہت سے مخلص ایسے ہیں جو جوش میں آکر ہوش سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں اور مصالح اور مفاسد کے درمیان توازن قایم نہیں رکھ سکتے۔ بہرحال جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا اور حافظ ہدایت حسین کی حمیّت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے کونسل کے ذریعہ موثر قانونی کارروائی کر ڈالی۔ حافظ کے لفظ سے یہ خیال نہ گزرے کہ موصوف کسی مسجد کے حجرے میں رہنے والے پرانے قسم کے حافظ جی ہیں۔ وہ بی۔ اے ہیں اور بیرسٹر ہیں اور بارہا یورپ کے دیدہ اور صاحب رسیدہ ہیں، خاں بہادر سی آئی ای ہیں لیکن اس پر دین کی یہ حمیّت و نصرت ہے۔ اس سے قبل فتنۂ نگار کے معاملے میں بھی موصوف[۵]

---

۵ انھی دنوں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے نیاز فتح پوری کے "نگار" میں (باقی اگلے صفحہ پر)

ایسی ہی ہمت، مستعدی کا اظہار کر چکے ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَّشَاءُ"

۲ مارچ ۱۹۳۳ء کے "سچ" کے شمارے میں ایک مضمون "گندگی کا ایک قدرداں" کے عنوان سے نظر آتا ہے۔ "انگارے سیریز" کا یہ طویل ترین مضمون ہے۔ گذشتہ تمام مضامین "سچی باتیں" (اداریہ) کے تحت لکھے گئے تھے اس لیے اغلب ہے کہ مدیر سچ ماجد دریابادی صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوں گے۔ لیکن "گندگی کا ایک قدردان" صفحہ چار پر دونوں کالموں کو محیط کیے ہوئے ہے اور اس مضمون پر مصنف کا نام —— "عبدالماجد" درج ہے۔ مضمون کی ابتدا میں "انگارے کی کہانی" بادل نہیں آتے — (صفحہ ۱۳۸) کا اقتباس (کاش کہ ہمارے بال ...... کٹاری کا مزہ چکھ لو) دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مضمون شروع ہوتا ہے :۔

"اتنی عبارت تو خدا معلوم کس طرح دل پر جبر کر کے اور یہ دعائیں مانگ مانگ کر کہ خدا نہ کرے ان ٹکڑوں پر کسی شریف گھرانے کے لڑکوں اور لڑکیوں کی نظر پڑے، نقل کر دی گئی۔ لیکن اس کے باوجود جو فقرے ہیں وہ گندگی اور عریانی میں اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی نقل کی ہمت کسی طرح بھی نہ پڑی۔

یہ اقتباس کس کتاب کے ہیں؟ اسی گندی اور شرمناک کتاب جس کا ذکر ان اوراق میں، بغیر مصنف اور تصنیف کے نام کی تصریح کے دو بار آچکا ہے اور جو اس وقت تک انشاء اللہ یو پی میں حافظ ہدایت حسین صاحب ممبر کونسل کی غیرت ایمانی کے طفیل ضبط بھی ہو چکی ہو گی۔

۱۳۴ صفحات کی گندگی کی اس پوٹ کے لیے موزوں جگہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔ یا تو ان کاغذی انگاروں کو آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں

حاشیہ گذشتہ سے پیوست :۔ شائع ہونے والے بعض مضامین کو مذہب کے خلاف اور مسلم مخالف بتایا تھا۔ حافظ ہدایت حسین صاحب نے "نگار" کے خلاف بھی آواز اٹھائی تھی۔

جھونک دیا جائے اور یا پھر انھیں ہاتھ سے پارہ پارہ اور پیر سے مسل کر آبادی کے باہر ان مقامات پر پھنکوا دیا جائے جہاں انسانی آبادی کے غلیظ اور فضلہ کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے سارے اسلامی پریس نے بحمد اللہ متفق اللفظ ہو کر اس کو اسی قابل سمجھا لیکن ایک استثنا رہا اور اسی استثناء نے مجبور کر دیا کہ گندگی کے اس قدر دان کو ملت اسلامیہ سے پوری طرح روشناس کرایا جائے۔ ملک کے طول وعرض میں یہ شرف ایک ماہوار رسالہ کے حصہ میں آیا کہ اس نے ایک نیم مدحیہ ریویو تقریباً تین صفحہ کا کر کے تصنیف اور مصنفؔ دونوں کے حق میں ٹھیک مغربی انداز سے پروپیگنڈے کا حق ادا کر دیا۔ اب آپ حیرت سے دریافت کریں گے کہ ایسا گندہ نواز رسالہ کون ہوسکتا ہے؟ کیا نگار؟ جواب میں یہ سن کر آپ کو حیرت سے زیادہ قلق و تاسف ہوگا کہ وہ رسالہ نیاز فتحپوری کا نہیں بلکہ آپ کی قومی، ملی، علمی، درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترجمان رسالہ "جامعہ" ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! جو کفر از کعبہ الخ۔"

اسی مضمون میں آگے اس بات پر اظہار تاسف کیا گیا ہے کہ تبصرے میں کتاب کے ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ دیا گیا ہے۔ اگر مکتبہ کی تاجرانہ ذہنیت ایسی پستی پر اُتر آئی ہے تو کیوں نہ لیکھرام اور راجپال کی تصانیف اور اشتہاری دوا فروشوں کی ایجنسیاں بھی لے لی جائیں۔

مضمون کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کو نہ صرف "انگارے" کی اشاعت سے بلکہ "انگارے" پر تبصرہ شائع ہونے سے قلبی تکلیف پہنچی ہے لیکن معاملہ دراصل کچھ اور ہے اگرچہ "خدا گواہ ہے کہ جامعہ کی مخالفت میں جب جب قلم اُٹھانا پڑا ہے تو دل کو اذیت محسوس ہوئی ہے۔" لیکن وہ اگلی سطور میں خود ہی پردہ اُٹھاتے ہیں:

"خانگی خطوط لکھے جاتے ہیں تو ان کا جواب مرحمت نہیں ہوتا۔ پھر بجز اخبار میں لکھنے کے لیے اور چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے

جامعہ نے سیرت محمد علی لکھوائی۔ مسودہ شروع سے آخر تک شیخ الجامعہ کی نظر سے
گزرا۔ انھوں نے مختصر دیباچہ لکھا۔ کتاب چھپ کر تیار ہو گئی۔ اس کے بعد یہ
خیال پیدا ہوا کہ بعض مقامات فلاں فلاں صاحبوں کو شاید گراں گزریں
گے۔ اشاعت روک کر سطر دو سطر نہیں ورق کے ورق بدلے گئے۔ ان اوراق
کی نئے سرے سے کتابت ہوئی، طباعت ہوئی اور اس میں ہفتوں لگے
یہ سب کچھ معدودے چند افراد کی خاطر گوارہ کیا گیا۔"

صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی ناراضگی کی وجہ دراصل کچھ اور ہے۔ مکتبہ جامعہ نے
مولانا محمد علی کی حیات پر ایک کتاب "سیرت محمد علی" ہو بہو شائع کرنے سے انکار کر دیا
تھا۔ یہ کتاب رئیس احمد جعفری اور مولانا عبدالماجد دریا بادی نے مشترکہ طور پر تصنیف
کی تھی۔ کتاب کے جن حصوں پر شیخ الجامعہ کا نزلہ گرا اتفاق سے وہ مولانا کے تحریر کردہ تھے
یہی وجہ ہے کہ مولانا "انگارے" کے تبصرے کو بہانہ بنا کر جامعہ کے خلاف انتقامی کارروائی
کرنا چاہتے ہیں اور ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی جس سے بار
بار چندوں کی اپیل ہوتی ہے، اس قابل بھی نہیں کہ اس کے جذبات کی اتنی بھی پرواہ
کی جائے۔[1]"

"گندگی کا ایک قدردان" میں اعتراف کیا گیا ہے کہ "جامعہ ریویو نگار نے جابجا
کتاب کے معائب کا بھی اظہار کیا ہے اور اس کے بعض حصّوں کی فحش نگاری کو تسلیم کیا
ہے۔" لیکن چونکہ جامعہ نے اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے جس کو مولانا عبدالماجد دریا بادی
صاحب "شرمناک کتاب" قرار دے چکے ہیں۔ اور تبصرہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ترجمان
"جامعہ" میں شائع کیا گیا ہے۔ جامعہ ملّیہ وہ ادارہ ہے جس نے مولانا عبدالماجد صاحب کی
تصنیف "سیرت محمد علی" کو بغیر ترمیم کے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے وہ
قابلِ مذمت ہے۔ اگرچہ مکتبہ جامعہ نے "سیرت محمد علی" کچھ عرصہ بعد شائع کر دی تھی" سچ"

---

[1] "سچ" لکھنؤ۔ ۱۷ مارچ ۱۹۳۳ء ص۲

کے ۱۶؍جون ۱۹۳۳ء کے شمارے میں "سیرت محمد علی" کا اشتہار شائع کیا گیا ہے[۱] جس کے مطابق ہندوستان میں اردو کے سب سے بڑے ادارے مکتبہ جامعہ نے "سیرت محمد علی" شائع کی ہے وہ مکتبہ الناظر، لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مکتبہ "الناظر" اخبار "سچ" کا ہی ادارہ تھا اس کے بعد جامعہ ملّیہ کی مخالفت میں کوئی مضمون شائع نہیں کیا گیا۔ کاش مکتبہ جامعہ اگر کچھ دن پہلے مصالحت کر لیتا تو "گندگی کا ایک قدردان" جیسا مضمون شائع نہ ہوتا جس کا اثر جامعہ پر نہیں بلکہ "انگارے" پر پڑا۔ اسی زمانے میں "زمانہ" کانپور اور "اردو" اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق نے "انگارے" پر تبصرے شائع کیے[۲] لیکن مولانا عبدالماجد صاحب نے ان پر ایک بھی سطر نہ ضائع کی۔ صاف ظاہر ہے کہ مولانا کا مضمون ذاتی کدورت پر مبنی ہے۔

جس تبصرے کی پاداش میں "تبصرہ نگار" کو "بدمذاق" اور "بدتمیز و بدعقیدہ" کہا گیا ہے، جس کے تبصرے کو بیر بخارا کے شہدوں کی زبان اور سرا کی بھٹیاریوں کا انداز کہا گیا ہے[۳] وہ تبصرہ رسالہ "جامعہ" کے فروری ۱۹۳۳ء کے شمارے میں تین صفحات پر شائع کیا گیا تھا۔ اس وقت "جامعہ" اسلم جیراج پوری اور ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ تنقید و تبصرہ کے مستقل کالم کے تحت شائع کیا گیا تھا۔ یہ تبصرہ "م" کے قلمی نام سے شائع کیا گیا تھا۔ "م" کے قلمی نام سے یہ تبصرہ کس نے لکھا تھا، معلوم نہ ہو سکا لیکن "جامعہ" کے بعض موجودہ ذمہ داروں کا خیال ہے کہ یہ تبصرہ پروفیسر مجیب کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ یہ تبصرہ پروفیسر مجیب کا تحریر کردہ ہو یا مبصر کوئی دوسرے ادیب ہوں لیکن یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تبصرے سے مدیر "جامعہ" ڈاکٹر عابد حسین متفق تھے۔ یہ اہم نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس وقت "شیخ الجامعہ" ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو "جامعہ" اور مکتبہ جامعہ سے جذباتی طور پر وابستہ تھے اور جامعہ کی نقل و حمل پر گہری نظر رکھتے تھے۔

۱ھ "سچ" لکھنؤ۔ ۱۶؍جون ۱۹۳۳ء ص ۶

۲ھ "اردو" اورنگ آباد، اپریل ۱۹۳۳ء ص ۴۱۳ اور "زمانہ" کانپور، مئی ۱۹۳۳ء ص ۳۳

۳ھ "گندگی کا ایک قدردان"۔ "سچ" لکھنؤ۔ ۱۰؍مارچ ۱۹۳۳ء ص ۲

تبصرہ نگار " م " لکھتا ہے :-

"یورپ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اچھی صورت والی عورتیں جب سیر کو نکلتی ہیں تو ایک یا دو معمولی و بھدّی صورت والیوں کو اپنے ہمراہ رکھتی ہیں۔ اس میں دونوں کا فائدہ رہتا ہے۔ اچھی صورت والی کا حسن نکھر آتا ہے اور بھدّی صورت والیوں کو سہارا مل جاتا ہے، اور لوگوں کو خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور ہے ورنہ ایسی حسین عورت اسے کیوں اپنے ساتھ رکھتی۔ عورتوں کا ایسی چالیں تو چلنا سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ افسانہ نویس بھی باہمی امداد کے ایسے طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔" انگارے" اس کوشش کی پہلی مثال ہے، جو ہماری نظر سے گزری اور اسی کو دیکھ کر ہمارا خیال ہو گیا ہے کہ اچھے افسانہ نویسوں کے لیے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ ان کا حسن نکھر آتا ہے لیکن پڑھنے والی طبیعت بد مزہ ہو جاتی ہے۔

سجّاد ظہیر کے اوصاف ان کے پہلے دو افسانوں میں ظاہر ہو گئے تھے۔ جو انھوں نے رسالہ 'جامعہ' میں شائع کیے۔ ان کے ہمراہیوں سے ابھی تک ہمارا تعارف نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کا تعارف ہی کرانے کے لیے ان کے افسانے بھی اس مجموعے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ انسانی ہمدردی ہر شکل میں تعریف کی مستحق ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ سجاد ظہیر صاحب نے اس مجموعے میں صرف اپنے تخیّل کے کارنامے پیش کیے ہوتے تو بہت بہتر ہوتا۔ " انگارے" واقعی انگارے ہیں محض افسانے نہیں۔ ان میں صرف زندگی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی زندگی، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہو، ہمارے معاشرے میں آگ لگ جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشرت، خیالات، عقائد، سب پر وار کیا گیا ہے۔ کہیں ان کی ہنسی اُڑائی گئی ہے، کہیں عیب ظاہر کیے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ غریبی، بے کسی، مظلومیت، جہالت کی درد انگیز تصویریں بھی ہیں

اور معاشرے کے خوشحال آزاد طبقے جو ظلم کرتے ہیں ان کی شکایت بھی کی گئی
ہم کو اپنی زندگی اور معاشرت کے تصور پر یہ اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ اس کو ہمارے
عقیدے اور تعصب سے اتفاق یا ہمدردی نہیں، اور جن چیزوں کا ہم احترام
کرتے ہیں ان کی وہ عزت اور قدر نہیں کرتا۔ تنقید کی آزادی نہ ہو تو اصلاح
کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ نخوت اور تکبّر جو تنقید کو توہین، اختلاف کو
عداوت اور خیالات کے بے تکلّف اظہار کو بدتمیزی قرار دے۔ خلوص اور سچّی
عقیدت کا سب سے کٹّر دشمن ہے لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصوّر کا
فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ چینی کا اس نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے
مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ گالی دینا بھی خیالات اور جذبات ظاہر
کرنے کا ایک طریقہ ہے اور جسے خدا نے زبان دی ہے اس سے ہم گالی دینے
کا حق نہیں چھین سکتے مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گالیاں دینے سے مطلب
کہاں تک نکلتا ہے، ہنسی اُڑانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ بعض بات
کو اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ کوئی ناصحانہ انداز ان کا مقابلہ
نہیں کر سکتا۔ بعض آدمی کو اتنا خفا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر کوئی اور بات سننا
گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے مگر افسوس ہے کہ "انگارے" کے
مصنفوں کو اس کا خیال نہیں رہا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "گندگی کا ایک قدردان" میں اسی تبصرے کی
بابت لکھا ہے کہ "ریویو نگار "م" صاحب ہیں۔ م صاحب کو اگر دوست پروری کا جذبہ
بیقرار کیے ہوئے تھے تو وہ کسی دوسرے پرچے میں اپنی پوری شخصیت کے اعلان کے ساتھ
اپنی گندی نوازی کو ظاہر فرما سکتے تھے۔" یہاں مولانا عبدالماجد صاحب سے قدرے متفق
ہونا پڑتا ہے۔ تبصرہ نگار "م" صاحب سجاد ظہیر سے ربط خاص[13] رکھتے ہیں۔ سجّاد ظہیر کی
کہانیوں کو خوبصورت یورپی عورت اور احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں
کو معمولی و بھدّی شکل والیوں کی تشبیہ دیتے ہیں۔ اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ "م" کے پردہ

نگاری میں کوئی اور معشوق نہیں بلکہ پروفیسر مجیب ہیں جو نہ صرف سجاد ظہیر کے دوست تھے بلکہ "انگارے" کی اشاعت سے قبل سجاد ظہیر کے دو افسانے "جامعہ" میں شائع کرا چکے تھے۔ تین صفحات پر مشتمل اس تبصرے کے ڈھائی صفحات میں سجاد ظہیر کے افسانوں کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ باقی نصف صفحے میں بقیہ تینوں افسانہ نگاروں کو ٹرخا دیا گیا ہے۔

سجاد ظہیر کے افسانے "گرمیوں کی ایک رات" اور "جنّت کی بشارت" کے طویل اقتباسات نقل کرنے کے بعد بہترین افسانے قرار دیے گئے ہیں "نیند نہیں آتی" اور "پھر یہ ہنگامہ" کے بارے میں تبصرہ نگار کا فیصلہ ہے کہ "ذہن کی سرسامی کیفیت دکھاتے ہیں یورپ کی افسانہ نویسی سب سے جدید طریقہ یہی ہے لیکن ہمارا مذاق ایسی بے سر و پا باتوں کو شاید ہی گوارا کر سکے۔ امجد علی صاحب کے دونوں افسانے اسی رنگ کے ہیں۔ ایک بہت فحش ہے دوسرا بہت پُر درد ہو سکتا تھا مگر انداز بیان نے اس کے اثر کو بہت کچھ زائل کر دیا ہے"۔ تبصرہ نگار کی لاپرواہی یا کاتب کی غلطی کی وجہ سے احمد علی کا نام امجد علی لکھا گیا ہے۔

رشید جہاں کے افسانے کو بے لطف قصہ بتایا گیا ہے اور ڈرامے کی تضحیک ان الفاظ میں کی گئی ہے :۔

> "ڈرامے میں ایک پردہ نشین عورت کے دل اور اس کے گھر کا حال سنایا گیا ہے بیویوں کو اپنے شوہر سے طرح طرح کی شکایتیں ہوتی ہیں لیکن ہمیں اس ڈرامے میں بتایا ہے کہ ماں کو اس کے بچّے بھی دوبھر ہو جاتے ہیں"۔

محمود الظفر کے افسانہ "جوانمردی" کو بھی بے رس بتایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ تبصرہ "انگارے" کے خلاف ہی ہے چونکہ انداز تحریر سے اختلاف کیا گیا ہے اور سماجی مسائل پر ان مصنفین کی تنقید اور نکتہ چینی کو ناپسند کیا گیا ہے۔

"سچ"، لکھنؤ کے ۲۴ مارچ ۱۹۳۳ء کے شمارے میں "مسلم یونی ورسٹی کے یہ استاد کون ہیں؟" کی سرخی کے ساتھ ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی کہ علیگڑھ یونی ورسٹی میں ایک

؎ تنقید و تبصرہ "جامعہ" دہلی۔ فروری ۱۹۳۳ء

"استاد بطور خود اس گندگی کی پوٹ اور غلاظت کے ٹوکرے کی دوکان لگائے بیٹھا ہے"۔
اسی خبر کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ علیگڑھ مسلم یونی ورسٹی بُک ڈپو بھی "انگارے" فروخت کر رہا تھا لیکن مولوی ڈپٹی حبیب اللہ خاں نے یونی ورسٹی کورٹ میں ممبر کورٹ کی حیثیت سے آواز اٹھائی تو نواب اسماعیل خاں خازن یونی ورسٹی نے اس کی فروخت پر پابندی لگادی۔

علیگڑھ یونی ورسٹی کے یہ استاد کون تھے! یہ عقدہ کھُلنا بہت مشکل ہے۔ "بوجھو تو جانو" انداز میں شائع کی گئی یہ خبر پُراسرار صحافت کی خوبصورت مثال کہی جاسکتی ہے حتمی طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس خبر میں مسلم یونی ورسٹی کے کس استاد پر عتاب نازل ہوا ہے لیکن چھٹی حس رکھنے والے کچھ بزرگوں کا اندازہ ہے کہ یہاں وہ استاد" پروفیسر حبیب" ہیں۔ پروفیسر حبیب علیگڑھ یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھے اور ترقی پسند خیالات کی پاداش میں ایک خاص طبقہ کی نظروں میں ہمیشہ معتوب رہے۔

ترقی پسند افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ (حیات اللہ انصاری) ان دنوں علیگڑھ یونی ورسٹی کے طالب علم تھے اور "انگارے" کا مطالعہ خواجہ منظور حسین کے ایما پر کیا تھا۔ "انگارے" کا وہ نسخہ خواجہ صاحب نے ہی ان کو عاریتاً دیا تھا غالباً وہ "استاد" خواجہ منظور حسین ہی ہیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء کے سرکاری گزٹ میں ایک اعلان کے ذریعہ "انگارے" ضبط کرلیا گیا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ "انگارے" زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند اس بنا پر ضبط کرلیا گیا ہے کہ یہ کتاب ایک خاص فرقہ کے مذہبی جذبات اور عقائد کو مجروح کرتی ہے۔ آئندہ اس کتاب کا فروخت کرنا یا شائع کرنا جرم تصور کیا جائے گا۔[۱]

"انگارے" کی ضبطی کے اعلان کے بعد مخالفت کا طوفان کچھ تھما ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ۲۱ اپریل ۱۹۳۳ء کے شمارے میں "سچی باتیں" (اداریہ) میں ایک سرخی نظر آتی ہے[۲]:

---

۱ گزٹ۔ یونائٹڈ پروونس لکھنؤ۔ ۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء

۲ "سچ" لکھنؤ ۲۱ اپریل ۱۹۳۳ء ص۲

"ایک خبر سے متعلق دوسرا بیان :۔

"سچ" شمارہ ۱۱ میں ایک نہایت مستند اور معتبر اطلاع کی بنا پر یہ خبر غصہ اور التہاب کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ لکھنؤ کی گندی اور شرمناک کتاب مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ کے ایک استاد بطور خود فروخت کر رہے ہیں، ساتھ ہی اس پر یونی ورسٹی کے ذمہ دار حکام کو نج کے خطوط میں توجہ دلائی گئی تھی۔ اب یونی ورسٹی کے ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے کہ ـــــ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جو اطلاع آپ کو ملی صحیح نہ تھی۔ یہ تحقیقات اگر صحیح ہیں تو اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کتاب ضبطی کا باقاعدہ اعلان بھی اب عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ اس لیے اب یوں بھی کسی کو اس کے فروخت کرنے کی جرأت مشکل سے ہی ہو سکتی ہے۔"[1]

اس تردید میں بھی مدیر "سچ" نے اپنا انتہا پسندانہ رویہ باقی رکھا ہے۔ سابقہ اطلاع کو نہایت معتبر اور مستند بتایا ہے اور یونی ورسٹی کے بہت بڑے ذمہ دار افسر کے بیان کو پوری طرح قابلِ یقین نہ تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ تحقیقات اگر صحیح ہے!" گویا اس میں بھی شبہ کی گنجائش ہے۔ مدیر "سچ" نے اس غیر مصدقہ اطلاع کو اخبار میں شائع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ نجی خط میں بھی یونی ورسٹی کے ذمہ داران کی توجہ مبذول کی۔ یہاں پروفیسر قمر رئیس کا وہ قول یاد آتا ہے[2] کہ "۱۹۳۲ء کے آخر میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان حلقوں اور اداروں میں غیظ و غضب کی آگ سی دہک اٹھی جن کے مفاد اور ساکھ کو اس سے ضرب پہنچی تھی جو بڑی حد تک اس کا ہدف ملامت تھے۔"

"انگارے" سیریز کا آخری مضمون[2] "بدعقیدگی نہیں، بدتمیزی" کے عنوان سے "سچ"

---

۱ "تنقیدی تناظر" پروفیسر قمر رئیس۔ ص ۶۵

۲ سچی باتیں (اداریہ) "سچ" لکھنؤ ۲۸/ اپریل ۱۹۳۳ء ص ۲

میں ۲۸ راپریل ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون روزنامہ "حقیقت" لکھنؤ میں شائع شدہ مراسلے[1] کے ردِ عمل کے طور پر لکھا گیا تھا۔ مراسلے میں معترض صاحبان سے گزارش کی گئی تھی کہ "نقد و انتقاد، آرٹ اور ادب کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے اور مذہب کو ادب سے دور رکھنا چاہیے"۔ اس مراسلے کے جواب میں مدیر "سچ" نے خود کو مخاطب تصور کرتے ہوئے نہایت سخت الفاظ میں جواب دیا کہ "اگر ان کے زیادہ نہیں صرف دو کارٹون نکل جائیں۔ ان کے بزرگان خاندان کے ساتھ کوئی بے ادب اسی قسم کا لطف و تفریح حاصل کرنا چاہے تو یہ فوراً آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ لیکن مذہب کو گندے سے گندہ گالیاں بھی شہدوں اور لقوں کی زبان میں دی جائیں اس پر نوٹس لینا ان حضرت کے نزدیک تنگ خیالی اور عدم رواداری کی دلیل"۔

بقیہ مضمون میں عیسائیوں اور آریہ سماجیوں پر لعن طعن اور مسلمانوں و اسلام کی عالی ظرفی، وسیع النظری اور مسلک صلح کل کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے۔ پھر اپنی بات کو مدلّل اور موثر بنانے کے لیے منشی پریم چند کا غیر ضروری حوالہ دیا گیا ہے[2]۔

"منشی پریم چند اردو کے مشہور افسانہ نگار، مسلمان نہیں ہندو ہیں۔ ایک روز ریل پر ان کا ساتھ ہو گیا۔ میں نے یہ گندی کتاب نکال کر انھیں دکھائی۔ چند ہی سطریں پڑھ کر بیزار ہو گئے۔ اور ادھر ادھر سے دس بیس ورق پڑھ کر تو یہ حال ہوا کہ لکھنے والوں کی بدتمیزی، پست مذاقی بازاریت، فحش پسندی اور گندہ زبانی پر بار بار تقریریں کرتے تھے ظاہر ہے کہ صدمہ ان کے عقائد کو نہیں جذباتِ شرافت کو پہنچ رہا تھا حیف ہے کہ ایسی کھلی ہوئی گندگی کے کچھ موئد مسلمانوں میں بھی موجود ہوں[3]"۔

۱۔ مراسلات۔ روزنامہ "حقیقت" لکھنؤ ۲۴ راپریل ۱۹۳۳ء ص۷

۲۔ "سچ" لکھنؤ ۲۸ راپریل ۱۹۳۳ء ص۲

۳۔ "سچ" لکھنؤ ۲۸ راپریل ۱۹۳۳ء ص۲

خطائے بزرگاں گرفتن خطااست، لیکن تحقیقی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں مدیر" سچ "نے کذب واختراع کا سہارالیا ہے پریم چند کا حوالہ محض " ہندوادیب" کی حمایت کا اظہار کرکے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ یہ مضمون " بدعقیدگی نہیں، بدتمیزی "۲۸ر اپریل ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۳ء کے شمارے میں بھی " انگارے "سے متعلق ایک تردیدی خبر شائع ہوئی تھی لیکن پریم چند کا کوئی حوالہ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۳ء یا اس سے قبل کسی شمارے میں نہیں دیا گیا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ منشی پریم چند سے مدیر" سچ " کی ریل میں ملاقات ۲۱ر اپریل ۱۹۳۳ء اور ۲۸ر اپریل ۱۹۳۳ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ پریم چند نے اس عرصہ میں کوئی سفر نہیں کیا۔ ماہ اپریل میں پریم چند بنارس میں ہی مقیم رہے۔ اپنی بیٹی کملا کی علالت کی اطلاع پاکر ۲ر مئی ۱۹۳۳ء کو ساگر روانہ ہوئے۔ اس ہفتہ کی مکمل روئیداد حسب ذیل[1] ہے:۔

۲۱ر اپریل ۱۹۳۳ء:۔ وشنو پربھاکر نے اپنے مضمون کے متعلق استفسار کیا۔ پریم چند نے بنارس سے ہی وشنو پربھاکر کو جواب دیتے ہوئے لکھا: آپ کا مضمون شائع تو کرنا چاہتا ہوں لیکن جس شکل میں وہ ہے اس شکل میں نہیں۔

۲۴ر اپریل:۔ " جاگرن" میں " جاگرن" لکھنؤ شروع ہونے کا اشتہار شائع کیا۔

۲۶ر " ۔ بیٹی کملا دیوی کے پہلے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع موصول ہوئی۔

۲۹۔۳۰ " ۔ کملا کو بخار ہو گیا، اطلاع بنارس میں ہی موصول ہوئی۔

یکم مئی ۔ کملا کی علالت کا تار وصول کیا۔

پریم چند کی اس ہفتہ کی مصروفیات کی مکمل روئیداد دستیاب ہے۔ اگر بہ فرض

---

[1] پریم چند وشوکوش۔ کمل کشور گوینکا ص ۱۵۶

کیا جائے کہ پریم چند اور مدیر" سچ" کی یہ ملاقات پہلے کبھی ہو چکی ہے تو یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ پریم چند نے "انگارے" شائع ہونے کے بعد ۲۸/اپریل ۱۹۳۳ء تک صرف ایک سفر کیا۔ اور یہ سفر فروری ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتہ میں بنارس سے الہ آباد کا تھا[۱]۔ اور اسی ماہ میں واپس آئے۔ بفرض محال اس اثنا میں (۲۱/اپریل تا ۲۸/اپریل) کوئی ایسا پراسرار اور خفیہ سفر کیا ہو جس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں تو ایک قدرتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدیر" سچ" "شرمناک کتاب" شائع ہونے کے چھ ماہ بعد بھی کیوں کلیجے سے لگائے پھر رہے تھے۔

پریم چند چھوٹے چھوٹے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار مختلف اخبارات و جرائد میں کرتے تھے۔ "ہنس"، "جاگرن" کے علاوہ وہ "زمانہ" کانپور میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے کہیں بھی "انگارے" کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھا۔ کچھ عرصہ بعد چترسین شاستری کی کتاب "اسلام کا وش ورکش" (اسلام کا زہریلا درخت) شائع ہوئی جس میں قرآن کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ "بہشت میں شراب پینے کو، گوشت کھانے کو، ستر حوریں اور لونڈے موج کرنے کو ملیں گے[۲]۔"

پریم چند نے اس کتاب کو نہایت شرمناک، منافرت پھیلانے والی اور سنسنی پیدا کرنے والی کتاب بتایا اور چترسین شاستری سے ذاتی تعلقات کے باوجود تھوڑے سے دھن اور تھوڑے سے یش کے لالچ میں لکھی گئی پستک بتایا[۳]۔

اگر "انگارے" کے متعلق پریم چند کا یہی تاثر ہوتا تو وہ یقیناً ظاہر کرتے۔ "انگارے" کے سلسلے میں پریم چند کا کوئی مخالفانہ بیان اس لئے بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ "انگارے" کی ضبطی کے اعلان (۱۵/مارچ ۱۹۳۳ء) سے ایک دن قبل ہی خفیہ پولیس

۱ه پریم چند وشوکوش۔ کمل کشور گوینکا ص۱۵۲

۲ه اسلام کا وش ورکش۔ چترسین شاستری ص۴۳

۳ه پریم چند۔ وودھ پرسنگ۔ امرت رائے ص۲۱۶

کے انسپکٹر دلیپ سنگھ پریس میں آئے اور پریم چند کے ہندی کہانیوں کے مجموعہ "سمر یاترا" کی دو سو کاپیاں اُٹھا کر لے گئے۔[1] ایسے نازک وقت میں کسی دوسری کتاب کی ضبطی کی حمایت قیاساً ممکن نہیں ہے۔

احمد علی نے اپنے مضمون "پریم چند کی کچھ یادیں" میں لکھا ہے کہ[2]:۔

"........ مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت میرے دوست منشی رگھوپتی سہائے فراق اور منشی دیانرائن نگم بھی وہاں موجود تھے۔ منشی دیانرائن نگم کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی اور ہم لوگ "انگارے" نام کی اپنی کتاب کے متعلق باتیں کر رہے تھے ..... میرے دوست رگھوپتی سہائے فراق نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہی منشی پریم چند ہیں۔ وہ خوب گھل مل کر اور مزے لے لے کر باتیں کرتے تھے ....."

اگر پریم چند کو "انگارے" کے مصنفین سے کوئی اختلاف تھا تو یقیناً وہ احمد علی کے رو برو اس کا اظہار کر سکتے تھے اور اس سے بہتر دوسرا موقع کون سا ہوتا جب کہ یہ لوگ خود "انگارے" سے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔ اس واقعہ کے دو دن بعد ۱۴ فروری ۳۳ء کو پریم چند نے "انگارے" کے دوسرے مصنف سجاد ظہیر کے گھر پر ایک غیر رسمی محفل میں شرکت اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا آغاز کیا۔[3]

"انگارے" کے ضمن میں پریم چند کے نظریات کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے لیکن یقین سے کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے "انگارے" کا مطالعہ کیا تھا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر طور پر متاثر ہی ہوئے۔ پروفیسر قمر رئیس کا خیال[4] ہے کہ "دلاری" اور "انگارے" کی دوسری

۱؎ پریم چند و شو کوش۔ کمل کشور گوینکا ص ۱۵۴

۲؎ منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے۔ پروفیسر قمر رئیس ص ۵۹-۶۰

۳؎ پریم چند اور ان کا عہد (بحوالہ 'ہنس' پریم چند نمبر ص ۱۴۲)

۴؎ اردو افسانے میں 'انگارے' کی روایت (تنقیدی تناظر) قمر رئیس ص ۶۵

کہانیوں میں فن کا یہی وہ نیا تصور تھا جس نے نہ صرف حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی جیسے نوجوان ادیبوں کو متاثر کیا بلکہ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیبوں کو بھی اپنے فن کی پرانی روش بدلنے اور 'کفن' اور 'نئی بیوی' جیسے افسانے لکھنے پر اکسایا۔ (حیات اللہ انصاری نے راقم الحروف سے ایک گفتگو میں انکار کیا کہ انھوں نے "انگارے" کا کوئی اثر قبول کیا بلکہ انھوں نے "انگارے" کے افسانوں کو جیمس جوائس کی بھدی نقل بتایا۔ انصاری صاحب کے مطابق "انگارے" کی اشاعت پر رشید احمد صدیقی مرحوم اور آل احمد سرور نے بھی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ رشید صاحب نے دھیمے لہجے میں اور ذاتی گفتگو میں، سرور صاحب نے ایک مضمون کی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن مجھے تلاش بسیار کے بعد بھی وہ مضمون دستیاب نہ ہو سکا۔)

"سچ" کے تمام مضامین میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ "انگارے" اور مصنفین کا نام بغیر ذکر کیا جائے تاکہ مصنفین کو شہرت نہ ملے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ "سچ" داستان پارینہ بن چکا ہے، گلدستہ طاق نسیاں ہو گیا ہے! لیکن "انگارے" ابھی تک تابندہ و روشن ہیں۔ آج خلق کو "سچ" کا گھر "انگارے" کے پتے سے ہی ملتا ہے۔ اگر "سچ" میں "انگارے" کے خلاف یہ لایعنی بحث نہ چھیڑی جاتی، تو اس اخبار کا ذکر بھی اردو صحافت کی تاریخ میں ممکن نہ تھا۔ "انگارے" سلسلہ کے علاوہ بھی "سچ" کے زیادہ تر مضامین بے بنیاد الزامات دقیانوسی خیالات کی تبلیغ اور ذاتی رنجشوں پر مبنی ہوا کرتے تھے۔ بعض مضامین اور خبروں کا انداز تلذذ حاصل کرنے والا ہوتا تھا۔ مثلاً ۲ جون ۱۹۳۳ء کے شمارے میں مقابلہ حسن کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی۔

> "یورپ اور امریکہ کی حسین و نازنین بن بیاہیاں، حسن و نزاکت میں ممتاز سال میں ایک بار کسی مشہور مقام پر جمع ہوتی ہیں۔ وہاں ان کے حسن پر نمبر لگتے ہیں۔ کوئی ایک اس سال کے لیے ملکۂ حسن قرار پاتی ہیں۔ حسن کی ملکائیں کبھی عرصہ تک زندہ نہ رہیں۔ اکثر تو خودکشی کر کر کے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔......

اٹلی نے، ترکی نے، آسٹریا نے ان مقابلوں کی ممانعت کر دی ہے اور پچھلی ولایتی ڈاک سے خبر آئی کہ جرمنی میں بھی صبح و شام میں اس کی قانونی ممانعت ہونے والی ہے۔"

اس مختصر سے مضمون میں جو عجیب و غریب تجزیہ کیا گیا ہے وہ تمام ماہرین عمرانیات (SOCIOLOGISTS) کے لیے باعث عبرت ہے۔ اس تجزیے پر کہ اکثر حسن کی ملکائیں خودکشی کر کے مر جاتی ہیں۔ ایمائل درکھیم اور میکس ویبر بھی قبر میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ جس نکتہ پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی فلسفی کا ذہن پہنچا وہاں تو امریکہ کی SUICIDOLOGICAL RESEARCH INSTITUTE کے سائنس داں بھی نہ پہنچ سکے۔

صرف اسی خبر پر موقوف نہیں "سچ" کی فائلیں عجیب و غریب مضامین اور خبروں سے بھری پڑی ہیں۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں "مسلم یونی ورسٹی اور مخلوط تعلیم" کے عنوان سے مسلم یونی ورسٹی کورٹ کی مخلوط تعلیم کی تجویز کی مخالفت کی گئی۔ اس طرح کے مضامین شائع کرنے کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ مدیر "سچ" ایک خاص فرقہ کے لیے اخبارات شائع کرتے تھے اور اردو اخبارات کا معیار اس وقت بھی وہی تھا جو آج ہے۔ یہ اخبارات اپنے قارئین کا ذہن تشکیل دینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ قارئین کے ذہن کے مطابق اپنی صحافت کا رخ موڑتے ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مدیر "سچ" مولانا عبدالماجد دریا آبادی عنفوان شباب میں ملحد رہ چکے تھے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں مولانا نے لکھا ہے کہ بی۔ اے کے امتحان کے فارم میں مذہب کے کالم میں "اسلام" کی جگہ RATIONALIST لکھ دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک کا عرصہ مولانا نے الحاد کی نذر کیا۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی جو اس وقت کیننگ کالج تھی، سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت وہ پوری طرح ملحد ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں ان کی کتاب PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP لندن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی ان کا رویہ مذہب کے خلاف ہی رہا ہے۔ لیکن کتاب شائع ہونے کے ایک سال بعد ۱۹۱۸ء میں مذہب کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئے۔ حکیم عبدالقوی دریا آبادی کی ترتیب شدہ کتاب

"وفیات ماجدی" میں باقاعدہ مذہب کی طرف واپسی کا سنہ دیا گیا ہے[۱] اس لیے ممکن ہے کہ "سچ" کے کاروباری حریف مدیر "سچ" کی غلطی کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہوں یا مدیر "سچ" خود ہی اس طرح کے مضامین و خبریں شائع کرکے کفّارہ معصیت ادا کرنا چاہتے ہوں۔

جس وقت علامہ اقبال عطیہ فیضی سے دریافت کر رہے تھے:۔

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

اس وقت مولانا عبدالماجد صاحب مخلوط تعلیم اور "انگارے" کی مخالفت میں اپنی صحافت کے بہترین الفاظ قتل کر رہے تھے۔ اگر سوءِ ادب نہ ہوتا تو میں یہاں کسی ماہرِ نفسیات کا یہ قول نقل کرتا[۲]:

"سنجیدہ مقصد رکھنے والی مگر عام اخلاقیات کی ڈگر سے ہٹی ہوئی کتابوں کو فحش کہنے والے اکثر ادھیڑ عمر کے بدکار شخص ہوتے ہیں جن کے نزدیک فحش تحریریں جنسی جذبے کو مشتعل کرنے کے سامان سے مماثل ہوتی ہیں۔"

"انگارے" کی اشاعت ہنگامہ آرائی کی وجہ صرف یہی سمجھ میں آتی ہے کہ جس طبقہ کے مفادات پر ان افسانوں کی اشاعت سے ضرب پڑتی تھی اس طبقہ میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اُس غم و غصّہ کے اظہار کے لیے دو حربے استعمال کیے گئے۔ اول مذہب اور دوسرا سماجی اخلاقیات۔

ابتدا میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور "انگارے" کے خلاف مضمون لکھنے والے اکثر مضمون نگاروں نے "انگارے" کی ضبطی کا مطالبہ مذہبی دلآزاری کے سبب نہیں بلکہ فحش نگاری کی وجہ سے کیا۔ ان کے مطابق "مذہب پر حملے تو کہیں کہیں ضمناً آگئے ہیں لیکن شرافت، تہذیب و اخلاق پر حملے تو مسلسل اول سے آخر تک ہیں[۳]۔" کیا تہذیب و اخلاق کی کوئی عالمگیر

---

۱ "وفیات ماجدی" مرتبہ حکیم عبدالقوی دریا آبادی ص۹

۲ بحوالہ کہانی کے پانچ رنگ۔ شمیم حنفی ص۷۲

۳ "سچ" لکھنؤ ۲۴ فروری ۱۹۳۳ء ص۳

تعریف ممکن ہے؟ کہیں طوائف کا ذکر بھی گناہ کہیں طوائف بچوں کو آداب محفل سکھانے کے لیے ملازم رکھی جاتی ہے۔ اصطلاحات علمیہ کے بعض ماہرین یہ دور کی کوڑی لائے ھیں کہ PRONOGRAPHY کا مصدر یونانی لفظ PRONE بمعنی طوائف ہے چنانچہ طوائفوں کے بارے میں لکھنا فحاشی ہے[1]۔ اب آپ "سچ" میں شائع یہ خبر ملاحظہ کیجیے[2]:۔

"تہذیب لندن کی کہانی ان صفحات میں پڑھ کر ایک کرم فرمانے اعتراض کیا ہے کہ اس میں لندن کی پیشہ ور بیسواؤں کی تعداد بیس ہزار لکھ دی گئی ہے لیکن یہ نہ ظاہر کیا گیا کہ یہ تعداد کل کتنی آبادی کے درمیان ہے بہتر ہے یہ اب ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ لندن کی آبادی ستر پچھتر لاکھ کہی جاتی ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ اور باضابطہ لائسنس یاب بیسوائیں ۳۵ ہزار ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے صوبے یو۔پی کی آبادی کچھ کم پانچ کروڑ ہے اور یہاں بیسوائیں پوری پانچ ہزار بھی نہیں بلکہ بیسوائیں اور ان کی نائیکہ ملا کر بھی ۱۲ ،۴۷ ہیں۔"

کتنی دلچسپ بات ہے کہ اسی فاحشہ کا قصہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھیں تو صحافت کہلاتا ہے اگر سعادت حسن منٹو لکھے تو اسے ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور کی عدالت سے دفعہ ۲۹۲ پی پی ایس کے تحت ۳۰۰ روپے جرمانے کی سزا پاتا ہے[3]، سجاد ظہیر لکھیں تو کتاب ضبط ہو جاتی ہے۔ ؎

یہ جناب شیخ کا فلسفہ ہے عجیب سارے جہان سے
جو وہاں پیو تو حلال ہے جو یہاں پیو تو حرام ہے

"انگارے" کے افسانوں پر برانگیختہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ

۱ے بحوالہ کہانی کے پانچ رنگ شمیم حنفی ص۶۷

۲ے "سچ" لکھنؤ۔ ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء ص۲

۳ے "دستاویز" بلراج مین را

طبقے کے ان تصورات کو ٹھیس پہنچی تھی جو یہ لوگ سالہا سال سے اپنے بند ذہنوں میں پال رہے تھے۔ عریانی کا ذکر تو محض زیب داستان کے لیے تھا۔ "انگارے" میں عورت کو سماجی ظلم وستم سے بغاوت کے لیے اُکسایا گیا تھا۔ ایک خاتون افسانہ نگار رشید جہاں کے دو افسانے (ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ) بھی مجموعہ میں شامل تھے۔ عورت کے لیے ایک باندی اور بے زبان جانور کا تصور رکھنے والے لوگوں کو عورت کی یہ آزادی قطعاً نہ بھائی۔ مقبول ترین کتاب "بہشتی زیور" میں عورتوں کو مشورہ دیا گیا ہے[1]:-

"اگر مرد اپنی عورت کو حکم دے کہ اُس پہاڑ کے پتھر اٹھا کر اِس پہاڑ پر لے جاوے اور اس پہاڑ کے پتھر اٹھا کر تیسرے پہاڑ پر لے جاوے تو اس کو یہی کرنا چاہیے۔"

علامہ یوسف القرضاوی کی تصنیف "الحلال والحرام فی الاسلام" کے یہ اقتباسات[2] بھی غالباً بے محل نہ ہوں گے۔

زوجین کے معاشرتی حقوق کے بارے میں علامہ رقمطراز ہیں:-

"اسلام شوہر کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی بیوی کے منہ پر مارے کیونکہ یہ انسانی احترام کے خلاف ہے اور اس سے جسم کے اشرف حصّے کو جس میں جسم کے جملہ محاسن جمع ہیں، تکلیف پہنچتی ہے۔ گو نافرمان اور سرکش بیوی کو وقت ضرورت تادیب جائز ہے۔"

نافرمانی اور نزاع کی صورت میں علامہ موصوف کے یہ مشورے بھی قابل غور ہیں:-

"مرد گھر کا سردار اور خاندان کا سرپرست ہے۔ اسی بنا پر اس کی تخلیق اسی طرز پر ہوئی اور اس کے اندر اس کی استعداد پائی جاتی ہے اور کارگہ حیات میں اس کی حیثیت بھی یہی کچھ ہے۔ نیز وہ مہر اور نان نفقہ کا ذمہ دار ہے لہٰذا عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس کی اطاعت سے خروج

۱ء "بہشتی زیور" حصہ چہارم، مولانا اشرف علی تھانوی صفحہ ۳

۲ء "الحلال والحرام فی الاسلام" یوسف القرضاوی۔ ترجمہ شمس پیرزادہ صفحہ ۲۷۱

اختیار کرے اور اس سے سرکشی کرے.....“

”.......اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو پھر اس پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں اذیت دہ حد تک زد و کوب کرنے اور چہرے پر مارنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بعض عورتوں کے لیے بعض حالات میں یہی علاج کارگر ہوتا ہے۔“

ظاہر ہے کہ جہاں عورت کا تصور یہ ہو وہاں ایک عورت کے تحریر شدہ افسانوں کو ہضم کرنا آسان نہ تھا۔

”انگارے“ کی ضبطی ایک خاص فرقہ کی مذہبی دلآزاری کے ضمن میں زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند کے تحت عمل میں آئی تھی۔ اس دفعہ کے تحت کسی بھی مذہب کے پیرو کاروں کے عقائد کو مجروح کرنے والا تحریری مواد ضبط کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسانوں کے ایک مجموعے کی اشاعت سے مذہبی عقیدہ کس طرح مجروح ہوتا ہے؟ کیا ”انگارے“ کے افسانوں میں مذہبی عقائد پر بحث کی گئی ہے!

”انگارے“ کے بعض افسانوں میں اجہل ملاّؤں کے ان افعال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عقل اور مذہبی تصوّرات کے درمیان سخت کشمکش کا باعث ہو رہے لیکن ”اردو“ اورنگ آباد کے تبصرہ نگار کے الفاظ میں مشکل یہ ہو گئی ہے کہ مولویت کی تنقیص کو خاص مذہب کی تنقیص سمجھا جاتا ہے حالانکہ وکیل اور جج پر نکتہ چینی قانون پر نکتہ چینی کے مترادف نہیں ہے۔

ہمیشہ ادب و شاعری کا غالب رجحان مذہب اور مذہبی لوگوں کے خلاف رہا ہے لیکن کسی ایک ادیب یا شاعر کے کلام پر پابندی عائد کر کے اس رجحان کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ خدا پر طنز کی لاتعداد مثالیں اردو شاعری سے دی جاسکتی ہیں۔ سجاد ظہیر کی کہانی ”نیند نہیں آتی“ میں اس تصوّر پر طنز کیا گیا ہے جس میں خدا کو باقاعدہ شکل و صورت عطا کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ اسلوب کسی حد تک قابل اعتراض ہے اور اس کو زیادہ بہتر الفاظ میں کہا جا سکتا تھا:۔

”یہی عورتیں وہاں بھی چیخ و پکار مچائیں گی، وہ غمزے کریں گے، وہ آنکھیں ماریں گی کہ... میاں بے چارے خود اپنی داڑھی کھجانے لگیں گے۔“ احمد علی کی کہانی ”بادل کیوں نہیں

آتے "میں خدا کو محض ایک بہانہ؟ محض ایک دھوکا، خدا صرف ایک دھوکے کی ٹٹی" جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال جن کو عام طور سے مذہبی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

در دشت جنون من، جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمّت مردانہ

"تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" والی پوری نظم میں اقبال خدا پر انسان کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گوپال متّل خدا کے وجود سے ہی منکر ہیں: ؎

مبہم سا ایک فطرت انساں میں خوف ہے
اِس خوف کا کسی نے خدا نام رکھ دیا

نریش کمار شاد نے خدا پر حسن پرستی کی تہمت لگائی ہے: ؎

ہر حسین کافرہ کے ماتھے پر
اپنی عظمت کا تاج رکھتا ہے
تو بھی پروردگار میری طرح
عاشقانہ مزاج رکھتا ہے

اگر ان اشعار کو قابل مذمّت نہیں سمجھا جاتا تو سجاد ظہیر کی کہانی پر ہی پابندی عائد کرنے کا مطالبہ غیر منصفانہ معلوم ہوتا ہے۔

سجاد ظہیر کی ہی ایک کہانی "پھر یہ ہنگامہ" میں جبریل ایک کردار کے روبرو حاضر ہوتے ہیں تو وہ پہلی نظر میں انھیں ابلیس سمجھتا ہے:

"میں ابلیس نہیں ہوں، جبریل ہوں۔ میں تم پر اس کا الزام نہیں رکھنا چاہتا کہ تم مجھے ابلیس سمجھے، ابلیس بھی آخر میرا ہی ایسا ایک فرشتہ ہے۔ تم تو کیا تم سے بڑے بڑے بزرگوں نے اکثر مجھے ابلیس سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔ پیمبروں تک سے یہ غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اچھائی کا

فرشتہ ہوں۔ میری صورت سے تقدس ٹپکتا ہے۔ اگر ابلیس کی طرح حسین ہوتا تو شاید یہ لوگ مجھ سے اس طرح کا برتاؤ نہ کرتے۔"

پہلی نظر میں کہانی کا یہ حصہ نہایت اہانت آمیز معلوم ہوتا ہے لیکن اردو شاعری تو کافی قبل ہی جبریل کے ساتھ کہیں زیادہ اہانت آمیز سلوک کر چکی ہے۔

کل پچھلے پہر عین طرب کے ہنگام
پر تو یہ پڑا کس کا سر جام
تم کون ہو؟ جبریل ہوں، کیوں آئے ہو
سرکارِ فلک کے لیے کوئی پیغام

(جوش)

اقبال کی بعض نظموں میں جبریل اپنے بال و پر کے باوجود آسماں بہ در ابلیس کے رو برو پستہ قد نظر آتا ہے۔ ؎

میرا طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا جو بہ جو
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

کیا ان اشعار سے مذہبی دلآزاری نہیں ہوتی۔ اگر یہ مذہبی دلآزاری کے تحت میں نہیں آتے تو صرف بعض افسانہ نگار ہی کیوں مطعون ہوں؟

سجاد ظہیر کی ایک کہانی "نیند نہیں آتی" میں رسول مقبولؐ کی تعداد ازدواج پر طنز کیا گیا ہے جس سے واقعی مذہبی لوگوں کی دلآزاری ممکن ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی التزام رکھا جاتا ہے کہ باخدا دیوانہ باشد، با محمد ہوشیار۔ اگر ان حصوں کو افسانے میں شامل نہ کیا جاتا تو افسانے کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ بحث قطعی الگ ہے کہ شعور کی رَو پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن جو کچھ ذہن میں آتا ہے اس کا اظہار بعض اوقات بہت سی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ "نیند نہیں آتی" کا یہ حصہ تکلیف دہ حد تک قابل اعتراض ہے:-

"...... کرنے سے ایک ...... کی جان بچی۔ معلوم نہیں ایسے موقع

پر۔۔۔ بے چارے کیا کرتے تھے   نے ان کے بھی تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔"

ادب میں فحاشی کا مسئلہ بھی بڑا متنازعہ ہے کہ کسی مصنف پر فحاشی کا جرم عاید کرنے سے پہلے کم از کم تین باتوں کی تصدیق ہو جانی چاہیے۔ ایک تو یہ کہ متعلقہ تحریر کا بنیادی تاثر مجموعی طور پر جنسی واردات میں ایک ابتذال آمیز دلچسپی کی ترغیب دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تحریر کا مقصد معاصر معاشرتی رویوں اور ضابطوں کو جان بوجھ کر مجروح کرنا ہے اور تیسرے یہ کہ مصنف نے اپنی تحریر میں جو مواد پیش کیا ہے، اس کی سماجی قدر کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی بھی ادبی شہ پارے کو اس معیار پر رکھ کر یقیناً کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ادب محض جذبے کے اظہار کی ایک صورت نہیں ہے۔ کیونکہ ادب میں جنسی جذبہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ادب میں جنس کو بطور موضوع شامل کرنے والا طبقہ ہر قسم کی پابندی کو آزادئ اظہار پر قدغن مانتا ہے۔ دوسرا طبقہ اخلاقی قدروں کو بے راہ روی اور جنسی اشتعال انگیزی سے محفوظ رکھنے کا داعی ہے اور اس سلسلے میں احتساب تو ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ عملی زندگی میں جنس کا گزر اسی طبقہ میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں مجھے ایک ہندی روزنامہ میں شائع شدہ خبر یاد آتی ہے[1]۔ جس کے مطابق ایک امام مسجد (جن کا نام اخبار میں ظاہر نہیں کیا گیا) بُرقعہ اوڑھ کر ایک سینما ہال میں "ابھرتی جوانی" فلم دیکھتے ہوئے اس بنا پر پکڑے گئے کہ پولیس نے انھیں بُرقعہ میں چھپا ہوا دہشت پسند سمجھا۔

عریانی اور فحاشی بھی ایک شے نہیں ہے۔ بقول وزیر آغا[2] عریانی فطرت کا عطیہ ہے جب کہ فحاشی انسان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ عریانی باغ بہشت کے مکینوں کو بطور

---

[1] روزنامہ "امر اُجالا" بریلی (ہندی) ۲۶ر اپریل ۱۹۸۷ء
[2] "تنقید اور مجلسی تنقید" ڈاکٹر وزیر آغا۔ ص۳۲

تحفہ عطا ہوئی لیکن فحاشی کے شجر ممنوعہ کو انھوں نے اپنی مرضی سے انتخاب کیا. عجیب بات ہے کہ بیش تر جانوروں اور پرندوں کو فطرت نے لباس سے نوازا ہے جب کہ انسان کو برہنہ رکھنے پر اصرار کیا ہے. مگر یہ ننگا پن انسان کے لیے نعمت خداوندی بھی ثابت ہوا ہے کیونکہ علم الانسان کے ماہرین کے مطابق اگر انسان برہنہ نہ ہوتا تو اس کا دماغ کبھی اس قدر ترقی کر کے جانوروں کے دماغ پر سبقت حاصل نہ کر سکتا تھا. وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ننگا جسم زیادہ حسّاس ہوتا ہے اور معمولی سی خارجی تحریک یا لمس بھی اسے متاثر کرتا ہے. پھر جب جسم کا کوئی حصہ متاثر ہوتا ہے تو عصبی نظام اس کی خبر فی الفور دماغ کو بھیج دیتا ہے. چنانچہ جب انسان کے ننگے جسم نے لاکھوں برس تک اپنی زود حسی کے باعث دماغ کو خبروں کے ایک لامتناہی سلسلے کی آماجگاہ بنائے رکھا تو قدرتی طور پر انسانی دماغ کے سکریٹریٹ میں بھی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی.

عریانی فطرت کا عطیہ ہے اور اس لیے جب فن اس عطیے کو سمیٹتا ہے تو فنی ارتقا کے عمل کو سامنے لاتا ہے. اجنتا، ایلورا کی تصویریں فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں جب کہ جنوبی ہند میں بعض مندروں پر جنسی اتصال کے مناظر فحاشی کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں. فنّی عریانی سے جنسی جذبوں میں تہذیب کا عنصر شامل ہوتا ہے جب کہ فحاشی جنسی اشتہا کو مشتعل کرتی ہے. گاؤں کے کسی پنگھٹ پر برہنہ غسل کرتی ہوئی دوشیزہ عریاں ہے لیکن وہی دوشیزہ اپنے دبیز لباس کے باوجود بھرے بازار میں فحاشی کے ذیل میں آسکتی ہے. ادب میں جنس کا تصور دنیا کی ہر زبان میں اور ہر زمانے میں موجود رہا ہے بقول ش اختر[1]:-

”اس حقیقت کے باوجود کہ پیٹ کی بھوک کے بعد ہی جنسی بھوک ابھرتی ہے. ادب اور آرٹ کا سارا کلاسیکی سرمایہ جنس کے بنیادی تصورات محرکات اور ہیجانات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے“.

خود فرائڈ نے ادب کے تمام اصناف کو ناآسودہ جنسی خواہشات کی رقص گاہ بتایا ہے.

---

[1] ”اردو افسانوں میں رس بین ازم“ ش اختر صنہ۶

اگر اس تعریف کو تسلیم کیا جائے تو قدیم و جدید کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ فرائڈ نے جنسی جبلت کو EROS کا نام دے کر زندگی کی بنیادی جبلت قرار دیا ہے[1]:۔

AFTER LONG DOUBTS AND VACILLATIONS WE HAVE DECIDED TO ASSUME THE EXISTENCE OF ONLY TWO BASIC INSTINCTS, EROS AND DESTRUCTIVE INSTINCT.

جنسی رجحان شیر خوار بچوں میں بھی موجود ہوتا ہے جس کی آسودگی ماں کا دودھ پینے سے ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ یہ رجحان بھی نشو و نما پاتا ہے جو مناسب ماحول اور فضا کی غیر موجودگی میں جنسی کج روی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے جنسیت کو معاشرتی زندگی کی مستقل شاخ تسلیم کرتے ہوئے اس کی بنیاد جائز اور فطرت کے عین مطابق بتائی ہے۔ لیکن جنسیت کا اظہار ایک وجدانی احساسِ جمال کا خواہاں ہوتا ہے جس کی غیر موجودگی میں ادب ایک تیسرے درجے کی شے ہو کر رہ جاتا ہے۔ فراق کے الفاظ میں[2]:۔

"پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں بلکہ اس تعلق کو وجدانی اور جمالیاتی صفات سے متّصف کرنے کا نام ہے"

جنس کا ذکر ہر زبان و زمان کے ادب کا اہم جزو رہا ہے۔ ہندوستان کی قدیم ترین زبان سنسکرت سے لاتعداد حوالے دیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں صرف عربی اور فارسی کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عربی شاعری میں زمانہ جاہلیت سے ہی "جنس" جزو لاینفک رہی ہے۔ عربی زبان کے وہ منظوم شاہکار جو "سبعہ معلقات" کہلاتے ہیں۔ انھیں ادبی دنیا میں ہمہ گیر شہرت حاصل ہے۔ عربی زبان و ادب کی تاریخ میں ان کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ یہ اپنی

لہ An Outline of Psyco-Analysis. Sygmund Freud Page 5.

ع‍ہ خط بنام محمد طفیل۔ بحوالہ اختر شیرانی کی جنسی شاعری۔ ڈاکٹر قمر جہاں ص ۳۱

فنی خوبیوں، لسانی رعنائیوں اور غیر معمولی تاثرات کی وجہ سے آب زر سے لکھوا کر خانہ کعبہ کے اندر آویزاں کیے گئے تھے۔ یہ سات قصائد، ایّام جہالت کی عربی شاعری کے شاہکار ہیں۔ اگرچہ سبعہ معلّقات کے شعراء کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں بعض مورخوں نے نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ قیس کو بھی مذکورہ فہرست میں شامل کیا ہے[1] لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ سب سے پہلے اِمراؤالقیس کا قصیدہ خانہ کعبہ میں لٹکایا گیا تھا۔ ملحوظ رہے کہ یہ قصائد سونے کے پانی سے لکھوا کر خانہ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ اسی لیے معلّقات کہلاتے ہیں۔ ان قصائد میں بعض مقامات پر نہایت کریہہ جنسی مناظر دکھائے دیتے ہیں۔ یہ تمام قصائد انگریزی میں بھی[2] The Seven Odes کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

امراؤالقیس نے اپنے قصیدہ کے سولہویں اور سترہویں اشعار میں نہایت عریاں جنسی مناظر بیان کیے ہیں[3]۔

"اے عنترہ! میں تجھ سے خواہش وصل نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ تجھ جیسی بہت سی حسین اور جمیل عورتیں اور بھی ہیں کہ جو حاملہ ہیں۔ جن کے پاس رات کو گیا۔ اور بہت سے بچوں کو دودھ پلانے والی ہیں کہ جن کے پاس رات کی تاریکی میں پہنچ کر لذّت وصل کی ترغیب کے ذریعہ ان کو ایک سال کے بچّے کی طرف سے غافل کر دیا۔ دودھ پلانے والی عورتوں کی تخصیص اس لیے کہ ان میں جنسی خواہش کم ہوتی ہے۔"

"جب حفاظتی تعویذ پہنے ہوئے، ایک سال کا بچّہ اپنی ماں کی پشت سے روتا تھا تو وہ اپنے جسم کا اوپری حصہ اس کی طرف پھیر دیتی تھی تاکہ وہ

---

[1] "عربی ادب کی تاریخ" ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی ص۱۶۸

[2] A.I.ARBERRY- TheSeven Odes"

[3] قصائد سبعہ معلقات۔ ترجمہ امیر حسن نورانی ص۲۶

دودھ پیتا رہے اور نصف زیریں حصہ میرے نیچے رہتا تھا جس کو وہ نہیں پھیرتی تھی۔"

ناسازگار حالات کا بیان کرنے کے بعد شاعر اٹھائیسویں شعر میں کہتاہے کہ:-

" ان حالات میں، میں اپنی محبوبہ کے پاس اس وقت پہنچا جب اس نے اپنے کپڑے اتار ڈالے تھے ...."

۳۲ ویں شعر میں کہتا ہے :-

" تو میں نے اس کی زلفوں کی دونوں لٹیں پکڑ کر اس کو اپنی طرف جھکایا، تو وہ بلا عذر جھک آئی۔ اس کی کمر بہت پتلی اور پنڈلیاں گداز ہیں"۔

امراؤالقیس کے علاوہ مہلہل اور عنترہ بن شداد العبسی کی شاعری میں جنسیت بے حد نمایاں ہے۔ عنترہ کا قصیدہ بھی معلقات میں شامل ہے۔ اس قصیدہ میں عنترہ نے نہایت عریانی سے کام لیاہے اس قصیدہ کے تینتالیسویں شعر میں وہ کہتا ہے :-

" میں نے حسین و جمیل عورتوں کے شوہروں کو اس طرح مار گرایا کہ خوف کے باعث ان کے شانوں کا گوشت پھڑکتا تھا اوران سے خون ایسی تیزی سے نکل رہا تھا کہ اس کی آواز ہونٹ کٹے آدمی کی آواز سے مشابہ تھی"۔

عربی شاعری میں جنسی شاعری کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ جاہلیت میں شعرا اپنی محبوبہ کا کھلے عام ذکر کرتے تھے۔ معاملات حسن وعشق اور جنسی ارتباط ہی نہیں بلکہ عربی شاعری میں جنسیت کا ذکر بھی کافی ملتاہے۔ شاعری کے علاوہ ابوتمام کی عربی تصنیف " حماسہ" میں جنسی امور کا ذکر تفصیل سے ملتاہے۔ چونکہ فارسی شاعری کی بنیاد عربی شاعری تھی اس لیے فارسی شاعری میں بھی جنسی کوائف بآسانی دستیاب ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے بارے میں مشہور ہے۔ ؎

مثنوی و مولوی و معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

لیکن اسی ہست قرآں در زبان پہلوی میں جنسی موضوعات نہایت بے تکلفانہ انداز میں موجود ہیں۔ حافظ شیرازی نے بھی اپنی کافی غزلوں میں یہ رنگ روا رکھا ہے۔

مئے دہ سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

با دوست نشیں بادہ جام طلب
بوسہ ز لب سرو گل اندام طلب

چونکہ اردو شاعری کا خمیر فارسی شاعری سے اُٹھا ہے اسی لیے یہ تمام انداز اردو شاعری میں بھی در آئے۔ اردو شاعری کے ابتدائی نمونے دکنی شاعری میں ملتے ہیں۔ وہاں جنسیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کا کام ایسے لاتعداد اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ ؎

کہیا کہ بوسہ ستی ہمیں تم جواں کرو
کہے پرت کی بات تمن جیوں کا جاں کرو

لیکن قلی قطب شاہ کا ایک خطرناک رجحان یہ ہے کہ وہ تمام جنسی حقائق کو نبیؐ کا صدقہ اور علی کا نظر کرم سمجھتا ہے۔ ؎

نبی صدقے پرت باغاں میں عشرت کرتا ہوں کرسوں
قطب شہ کو کھلائیاں ہیں سہیلیاں رنگ بھرا میوہ

جاوید وششٹ نے قلی کے رنگ سخن کو اردو کی پہلی جنسی شاعری قرار دیا ہے۔[۱] قلی قطب شاہ کی لاتعداد محبوبائیں محل میں موجود تھیں۔ اُنیس[۱۹] محبوباؤں کا ذکر خود بادشاہ نے بڑی محبت سے کیا ہے اور بارہ محبوباؤں کو بارہ اماموں کی رعایت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

---

[۱] مقدمہ "روپ رس" محمد قلی قطب شاہ۔ مرتبہ جاوید وششٹ

نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھی
کرو عیش جم بارا پیاریوں سوں پیارے

قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں گوری، چھبیلی، لالہ، لالن، موہن، محبوب، مشتری، حیدر محل، ننھی سانولی، کنولی اور پیاری کا ذکر کیا ہے۔

دکن کا دوسرا شاعر عادل شاہ ہے جس کو دنیا میں صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک طبور اور دوسری خوب صورت عورت[1]۔ عادل شاہ کی "نورس" میں عورت کا جمال اور وصال کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے[2]:۔

"یہ عشق مجازی اور جسمانی ہے جس کا اظہار ان گیتوں میں خوب صورتی کے ساتھ کیا گیا ہے:

پوہ بھائی تو دیکھ جایا ک دھاوے گا
ابراہیم کسو جاگ ایسا پیو کہاں پاوے گا"

عادل شاہ کا پوتا عادل شاہ ثانی شاہی جنسی شاعری کے معاملے اپنے دادا سے بہت آگے ہے۔ اس کا قصیدہ "چار در چار" جنسی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ "قصیدہ در منقبت حضرت امیرالمومنین" میں بھی اس کا رویہ جنسی ہی رہتا ہے۔ اس سے مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بھی جوبن، چھاتی، انگیا کے بغیر نہیں بنتی۔ شاہی کے بعد بھی دکن کے لاتعداد شعرا کے کلام میں عریانی بلکہ فحاشی کا ننگا ناچ دکھائی پڑتا ہے۔ نصرتی، رستمی ہاشمی کے یہاں ایسے بہت سے نمونے مل جاتے ہیں:

میں مست ہو کر سیج پر بیتاب ہو رہی تھی پنٹ
باتاں پرم کی کاڑ کر منجہ کیوں جگاتا سادے
(نصرتی)

---

[1] "کتاب نورس" مرتبہ نذیر احمد ص ۱۳۶
[2] "تاریخ ادب اردو" جمیل جالبی (جلد اول) ص ۲۱۵

ولی کے کلام میں بھی امرت لعل کی مدح میں اشعار ملتے ہیں جو جنسی امرد پرستی کا نمونہ ہیں۔ یہ رجحان صرف دکنی شعرا تک ہی محدود نہیں بلکہ شمالی ہند کے شعرا میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جعفر زٹلی کے کلام میں عریانیت کے نایاب نمونے موجود ہیں۔ جعفر کی نظم و نثر میں مردانہ و زنانہ جنسی اعضا کا بہ زبان عوام الناس دہلی بہت ذکر ہے۔ اس کی نظموں کے عنوانات بھی کچھ اس طرح ہیں:

قصیدہ عشق درباب شہوت[1]

درمقدمہ جماع گوید۔ گفتار جوڑنت نامہ[2]

...... سٹری نامہ[3]

جعفر زٹلی کے کلام میں لاتعداد اشعار متبذل جذبات اور سوقیانہ کلام کا نمونہ ہیں[4]۔

دختر کو توال ہے ظالم — بے گنا ہوں کو ٹانگ دیتی ہے

ناحق ستم کسی پر، یہ شوخ کر بھی — دیتی ہے ٹانگ اسی کو جو فعل بد کر بھی

جعفر زٹلی نے صرف نظم میں ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی اپنی ہرزہ گوئی کے جوہر دکھائے۔ ہجو دختر مرزا ذوالفقار بیگ کوتوال دہلی، نسخہ چورن امساک و ہاضمہ طعام، شرح چہرہ مکرندوائے قانون گو، اسی قبیل کی نثر کے کچھ نمونے ہیں جعفر زٹلی کے کلام کو قدمانے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ قائم نے لکھا ہے کہ ان کا کلام عوام و خواص میں مشہور ہے لیکن اتنا بتذل ہے کہ نقل نہیں کیا جا سکتا۔[5] لیکن آج حالات قدرے مختلف ہیں۔ اب دانش گاہوں میں جعفر کے کلام پر تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ کلیات میر جعفر زٹلی مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۱۵

۲۔ " " " ص ۲۰۱

۳۔ " " " ص ۲۰۳

۴۔ " " " ص ۱۵۱

۵۔ مخزن نکات ۔ قائم چاندپوری ص ۱۳

اور جعفر زٹلی کے نظم و نثر کا کلیات بھی علیگڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر نعیم احمد مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

جعفر زٹلی کی حیثیت ہمیشہ ایک فحش گو شاعر کی رہی ہے۔ لیکن میر، قائم، سودا کے کلام میں ایسے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں جن پر فحش گوئی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے:

ے لذت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں
پاس ہے زنڈی ولے ہے ضعف باہ — میر

ے مت مل اہل دول کے لڑکوں سے
میر جی ان سے مل فقیر ہوئے — میر

ے میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
... ... — میر

صاف چولی سے عیاں ہے بدن سرخ ترا
نہیں چھپتا تہہ شبنم چمن سرخ ترا
مصحفی

اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر
داغ

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
فراق

زندگی سے تعلق بہت ہے مگر سچ جو پوچھو تو بس اتنا ہے ماجرا
جیسے مرد جواں مشتعل ہو بہت، اور پہلو میں ہو اک زن حائضہ — نشتر خانقاہی

جسم اور اک نیم پوشیدہ ہوس آمادگی
آنکھ اور سیر لباس مختصر کرتی ہوئی — (ربانی)

یہ تمام مثالیں دے کر میرا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور "انگارے" پر معترض دوسرے بزرگوں کا یہ وہم قطعی بے بنیاد تھا کہ نیا ادب (یا انگارے" کے افسانے) جنسی مسائل پیدا کرنے والے ہیں۔ لذّتِ جسم کے مناظر صرف غزلوں کے ہی اشعار میں نہیں بلکہ مثنویات میں بھی بے محابا نظر آتے ہیں۔ مثنویات میں میرحسن، میر، شوق کی مثنویات میں ہی نہیں بلکہ درد جیسے صوفی شاعر اور مومن جیسے شاعر کی مثنویات میں بھی نظر آتے ہیں۔ مومن جو سید احمد بریلوی کی تحریک کے حمائتی تھے اور "امام زمانہ کی یاری کرو" جیسے نعرے لگاتے تھے، مثنوی میں فرماتے ہیں[1]:-

لب سے لب میرے ملائے رکھنا — بازو سے وہ سر اُٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا — مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے — ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ — جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار — واکرنے نہ دینا بند شلوار
وہ ہاتھ کو دم بہ دم جھٹکنا — وہ تکیے پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگانی وہ آہ لاتیں — حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکل جانا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا — کن بیکسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات

بھرتا ہی نہیں تیرا جی بس
کرتا ہی نہیں تو کبھی بس

درد کو اردو کا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ درد نے تصوف کے موضوع پر بھی

---

[1] مثنوی دوئم، کلیات مومن (مطبوعہ نول کشور)

ایک کتاب لکھی ہے۔ لیکن صوفی جی کی مثنوی کے اشعار ملاحظہ کیجیے[1] :-

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا	کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا	اور دل کھول کے چمٹ جانا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا	وہ ترا جیب کا لڑا دینا
ہولے ہولے پکارنے لگنا	ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منہ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا	چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ	نیند آتی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑ
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس	وہ ترا سست ہو کے کہنا بس
بات باقی نہیں رہی اب تو	رات باقی نہیں رہی اب تو
کہیں تیری یہ بات نبڑے گی	یا یونہی ساری رات نبڑے گی
مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں	صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں
دیکھو اب آگے مار بیٹھوں گی	یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو ریخ نکلے گی	منہ سے کیونکر نہ چیخ نکلے گی

کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا
دیکھو کون ساتھ سووے گا

اس طرح کے اشعار مصحفی کی "مثنوی بحر المحبت" میں بھی بغیر کسی تلاش و تحقیق کے بغیر مل جاتے ہیں۔ مصحفی کی "مثنوی بحر المحبت" کا ذکر بطور خاص اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس مثنوی کو ترتیب و مقدمہ کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس وقت میرے پیش نظر اس مثنوی کا جامع ایڈیشن ہے جس کو ۱۹۸۲ء میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے ایک شعر سے مسلمانوں کے بنیادی عقائد پر چوٹ لگتی ہے[2] :-

---

۱۔ "مثنوی خواجہ میر درد" انجمن ترقی اردو

۲۔ "مثنوی بحر المحبت (شیخ غلام ہمدانی مصحفی) مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ص۱۱

تھا آپ ہی دیوان مرا نامہ اعمال
کاہے کو فرشتوں نے لکھا نامہ اعمال

اسی مثنوی کے متعدد اشعار میں جنسیت اور فحاشی نظر آتی ہے۔ مشتے از خروارے[1] ملاحظہ ہوں۔

طرح ہو زیر آب صحبت وصل	یوں میسر ہو ان کو خلوت وصل
یہ حمائل کرے دو دست اس کی	چومی وہ لعل می پرست اس کی
لب سے لب کامیاب ہو تہہ آب	دوستی کا حساب ہو تہہ اب

نظیر اکبرآبادی اکثر نظموں میں جنسیت اور فحاشی نظر آتی ہے۔
"چاندنی رات" کا ایک بند ملاحظہ کیجیے[2]:۔

چاندنی تھی وہ چاندنی، چاندنی کا رنگ جس سے کم
پیتے تھے مے گھڑی گھڑی، لیتے تھے بوسے دمبدم
دونوں نشوں میں مست ہو سوئے پلنگ پر جبکہ ہم
عین مزہ تھا وصل کا اس میں نظیر ہے ستم
صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی میں ہی جی کی رہ گئی

ایک موضوعی غزل کا عنوان ہی "ازار بند" ہے[3]:۔

ایک رات میرے ساتھ وہ عیار مکرباز	لیٹی چھپا کے اپنا مُو لا ازار بند
جب سو گئی تو میں نے بھی دہشت میں آ	پہلے تو چپکے چپکے ٹٹولا ازار بند
آخر بڑی تلاش سے اس شوخ کا نظیر	جب آدھی رات گزری تو کھولا ازار بند

۱؎ "مثنوی بحرالمحبت" (شیخ غلام ہمدانی مصحفی) مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ص۲۶
۲؎ "روح نظیر" مولفہ اکبر آبادی ص۳۱۵
۳؎ " " ص۵۱۳

نظیر کی ایک اور نظم کے اس بند پر بھی ایک نظر واپس ڈالتے چلیے:[۵۱]

اس سینے کا وہ چاک ستم، اس کرتی کا تنزیب غضب

اس قد کی زینت قہر بلا، اس کا فرچپ کا زیب غضب

ان ڈبیوں کا آزار برا، ان گیندوں کا آسیب غضب

وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب

انگیا کی بھڑک، گوٹوں کی چمک، بندوں کی کساوٹ کیسی ہے

دراصل ادب میں جنسی تجربات کی شمولیت کا سوال حد درجہ پیچیدہ ہے۔ اگر قارئین کے جذبات و خیالات میں ہیجان پیدا کرنا ادیب کا نصب العین ہے تو وہ واقعی قابل مذمت ہے۔ لیکن ادب کے قاری کی حیثیت سے ہمارا سروکار محض یہ ہونا چاہیے کہ اس جنسی واردات کی جمالیاتی سطح پر منطقی اساس کیا ہے؟ جنسی تجربات کی یہ منظر کشی قارئین کو کوئی پیغام دیتی ہے یا محض جذبات برانگیختہ کرتی ہے! ممتاز شیریں نے منٹو کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ منٹو کے شہوت انگیز نسوانی کردار سوگندھی نیلم اور کلونت کور اپنے تیز جذبات کے ساتھ پھڑکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کیفیت کے ساتھ کہ اس تحریر کا کاغذ جن پر ان کا ذکر ہو تازہ گرم گوشت کی طرح پھڑکنے لگتا ہے۔" دوسری طرف منٹو کی کہانی "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمہ میں ایک گواہ صفائی ڈاکٹر سعید اللہ کا یہ بیان تھا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود "ٹھنڈا گوشت" بن گیا۔" دوسرے گواہ چودھری محمد یسین نے فرمایا کہ اس کہانی کا تھیم یہ ہے کہ "ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی"۔ ممتاز شیریں اور محترم گواہان کے بیان میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے وہ ادبی مبصرین اور مذہبی انتہا پسندوں کے انداز فکر کا فرق ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ادبی قدر و قیمت معین کرتے ہوئے ہمیں مبصرین کی ذہنی اور علمی سطح کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے۔

---

۵۱ "روح نظیر" مولفہ مخمور اکبرآبادی ص۱۵۰

فنّی اظہار کے تمام اسالیب کا سرچشمہ بنیادی طور پر انسانی تجربات ہوتے ہیں۔ ان انسانی تجربات کو بیان کرنا کبھی کبھی فحاشی ہو سکتی ہے ہمیشہ نہیں، بقول ڈاکٹر شمیم حنفی[۱] ایسے اصحاب جن کے تخیل کی زرخیزی طب کی کتابوں اور دینی رسائل میں بھی جنسی لذّت اندوزی کے وسائل کی دریافت پر قادر ہو۔ ان کا شعور کسی بھی ادب پارے میں دُرِّ مقصود کے حصول سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ ۱۸۳۴ء میں اسی قماش کے ایک بزرگ نوح ویبسٹر نے تو انجیل مقدس کی زبان میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اسی مولویانہ جوش کی مبالغہ آمیز صورت یہ ..... واقعہ ہے کہ گذشتہ صدی کے ایک نامعلوم مبصّر نے انجیل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جریدے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ اس مقدس کتاب کی زبان انتہائی فحش ہے اور اس لائق نہیں کہ اسے کسی مہذب مجمع میں دُہرایا جا سکے[۲]۔

مولانا عبدالماجد صاحب کا مسئلہ بھی یہی ہے ان کے نزدیک اس حقیقت کی کوئی اہمیت یہی ہے کہ جنسی تجربات کی وساطت سے پیچیدہ ترین حیات انسانی کے کس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان تجربات میں کیا معنویت پوشیدہ ہے یا کسی ادب پارے میں جنسی عناصر کی بنیاد پر کس اہم سماجی واردات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کے نزدیک وہ ادب پارے فحش ہیں جو کسی باریش مولوی نے تخلیق نہیں کیے ہیں۔ اور ان میں بعض جنسی معاملات کا ذکر کیا گیا ہے۔ باریش مولوی کی شرط میں نے اس لیے لگائی ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی تصنیف کردہ "بہشتی زیور" میں بھی دو چار بہت سخت مقام آئے ہیں۔ استحاضہ کا بیان[۳] اور جوان ہونے کا بیان[۴] میں جو شرح رقم کی گئی ہے وہ "انگارے" کے مصنفین کو شرمانے کے لیے کافی ہے۔

۱۔ "کہانی کے پانچ رنگ" شمیم حنفی ص ۵۱

۲۔ بحوالہ " " ص ۴۳

۳۔ "بہشتی زیور" مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دوسرا حصہ ص ۲

۴۔ " " " " ص ۱۵

"انگارے" پر کیے گئے اعتراضات میں ایک اہم اعتراض یہ بھی تھا کہ "انگارے" کے مصنفین انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور غیر ملکی تعلیم نے ان کے ذہن کی ساخت تبدیل کر دی ہے اسی لیے وہ ملکی مذاق سے آشنا نہیں رہے ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور جیمس جوائس کے زیر اثر لکھی گئی کہانیاں ہمارے میں برداشت نہیں کی جا سکتیں۔ دراصل کسی بھی زبان و ادب میں تبدیلی سماجی تغیرات کے ساتھ ناگزیر ہے۔ ادبی تغیرات سے بہت قبل ذہنی انقلاب برپا ہو چکا ہوتا ہے لیکن اردو پر انگریزی ادب کے اثرات کی کچھ سیاسی وجوہات بھی تھیں۔ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ بڑے پیمانے پر تراجم کا کام انجام دیا جا رہا تھا۔ گارساں دتاسی کے خطبات کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے[1] :-

پہلا خطبہ :-

"ان میں (حالیہ مطبوعات میں) قدیم و جدید زمانہ کی چند تاریخیں اور اخلاقی اور مذہبی کتابوں کے ترجمے ہیں مثلاً بینین کی "پلگرمس پراگرس" اور میسن کی "سیلف نالج"۔ قصے کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ریسے لاس اور قزلباش۔ نظموں کے ترجمے بھی کیے گئے ہیں۔ مثلاً گے کی حکایتوں کا ترجمہ۔"

دسواں خطبہ[2] :-

"مسٹر فیلن نے مجھے ایک اور کتاب بھجوائی جس کا نام "رسیدن نشہ" ہے۔ یہ شونارائن کی ایک انگریزی اخلاقی کہانی کا ترجمہ ہے۔ اس کا تمثیلی طرز بیان، مشرقی بیان کے بالکل مطابق ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کی ادبیات ہماری ذہنیت سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔ مگر

---

[1] خطبات۔ گارساں دتاسی پہلا خطبہ ۳ر دسمبر ۱۸۵۰ء ص ۵

[2] " " دسواں " ۷ر فروری ۱۸۶۱ء ص ۲۷۶

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں ایک خاص حسن و لطف ہے بقول ایک فارسی شاعر:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

ظاہر ہے کہ نہ صرف ہندوستانی، انگریزی ادب سے متاثر ہو رہے تھے بلکہ انگریز بھی کسی نہ کسی حد تک ہمارے ادب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ثابت ہوا کہ سماجی اور ادبی ارتباط کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر کرتا ہے۔

بہر حال حقائق کچھ بھی رہے ہوں "انگارے" کی اشاعت ایک متنازعہ مسئلہ بن گئی چہار جانب سے اعتراضات کی یلغار ہوئی اور "انگارے" کو زیر دفعہ ۲۹۵۔اے تعزیرات ہند، ایک فرقہ کے مذہبی عقائد کو مجروح کرنے کے الزام میں ضبط کر لیا گیا۔ دفعہ ۲۹۵۔اے کے تحت ایسی تحریریں جن سے کسی مذہبی گروہ کے عقائد کو ٹھیس پہنچنے کا خطرہ ہو، ضبط کی جاسکتی ہیں۔ خیریت گزری کہ صرف "انگارے" کی ضبطی ہوئی ورنہ تعزیرات ہند کی اس دفعہ کے تحت تین سال کی قید اور جرمانہ بھی کیا جاسکتا ہے[1]:۔

295A-DELIBRATE AND MALICIOUS ACT INTEND TO OUTRAGE RELIGIOUS FEELING OF ANY CLASS BY INSULTING ITS RELIGION OR RELIGIOUS BELIEFS.

WHOEVER, WITH DELIBERATE AND MALICIOUS INTENTION OF OUT RAGING THE RELIGIOUS FEELING OF ANY CLASS OF CITIZENS OF INDIA, BY WORDS, EITHER SPOKEN OR WRITTEN, OR OTHERWISE INSULTS, OR ATTEMPTS TO INSULT THE RELIGION OR THE RELIGIOUS BELIFFS OF THE CLASS, SHALL BE PUNISHED WITH IMPRISONMENT OF EITHER

---

[1] انڈین پینل کوڈ ۱۸۶۰، پی ایل ملک ص ۹۴

DESCRIPTION FOR A TERM WHICH MAY EXTEND TO THREE

YEARS, OR WITH FINE OR WITH BOTH.

ایک منفی پہلو یہ بھی رہا کہ ان اعتراضات کا موثر طریقہ سے جواب نہیں دیا جا سکا۔ وجہ شاید یہ ہو کہ "انگارے" کے مصنفین میں بے حد اہم شخصیت سجاد ظہیر کی تھی اور وہ واپس لندن چلے گئے تھے اور باقی افسانہ نگار شاید دل ہی دل میں "سیلی زناں، اعتراض صحافیاں مرنجید" کہہ کر خاموش ہو گئے، صرف محمود الظفر نے روزنامہ "لیڈر" الہ آباد میں ایک دو کالمی مزاحمتی مضمون لکھا[1] مضمون کا عنوان SHALL WE SUBMIT TO GAGGING? (INDEFENCE OF ANGAREY) تھا مضمون میں محمود الظفر نے "انگارے" پر عائد کی گئی پابندی پر اظہار افسوس کیا تھا۔ اور تمام ہم مذاق اہل قلم سے اپیل کی گئی تھی کہ "انگارے" کے انجام سے دل برداشتہ نہ ہوں اور مستقبل میں ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ترقی پسند ادیبوں کی ایک انجمن LEAGUE OF PROGRESSIVE AUTHORS کی تشکیل کا اعلان کیا گیا تھا۔ دلچسپی رکھنے والے تمام ادیبوں کو احمد علی سے رابطہ قایم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ان کا کوچہ پنڈت۔ دہلی کا پتہ دیا گیا تھا۔

فرانس کے آخری شہنشاہ اٹھارہویں لوئیس کی بگھی سے ایک معصوم بچے کے کچل جانے پر لوئیس نے ایک سکّہ بچے کی ماں طرف قیمتاً پھینک دیا تھا جسے اس بدنصیب ماں نے قبول نہیں کیا اور واپس لوئیس کی طرف اچھال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ کی محدود نظریں اس سکّے پر لگی ہوئی بغاوت کی مہر کو نہ دیکھ سکی تھیں۔ "انگارے" کے ضمن میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "برٹش سرکار" نے "انگارے" پر پابندی عائد کر کے بغاوت کو دعوت دی تھی اور عملی طور سے ترقی پسند تحریک کی ابتدا کرنے پر اکسایا تھا۔ احمد علی نے اپنے ایک مضمون "ترقی پسند تحریک اور تخلیقی مصنف" میں اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے[2]:۔

۱؎ "روزنامہ" لیڈر" الہ آباد (انگریزی) ۵ اپریل ۱۹۳۳ء

۲؎ "ترقی پسند تحریک اور تخلیقی مصنف" سیپ ۴ کراچی

"محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے۔ ان کی رضا مندی کا ذمّہ لیا۔ جو بعد میں انھوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیجدی۔ چنانچہ ۳۳-۳۲ ۱۹ء میں اس کے بانی مبانیوں کے ساتھ جو اصل مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادیٔ رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں۔ جو نسل انسانی کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔"

"انگارے" کے مصنّفین نے جدید اردو ادب میں بعض ترقی پسندانہ نظریات کی جس طور پذیرائی کی وہ ترقی پسندانہ عالمی نقطۂ نظر کے ساتھ اظہارِ یگانگت تھا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں دنیا کے چند اہم ادیبوں نے پہلی بار ادب کو تحریک بنانے پر زور دیا۔ یہ کانفرنس World Congress of the writers for the Defence of Culture. کے نام سے نازی ازم اور فاشزم کے دوہرے عفریت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے بنائی گئی تھی۔ ہنری باربس، میکسم گورکی، روماں رولاں، تھامس مان، آندرے مارلو اور والڈ فرینک وغیرہ شریک تھے۔ اس کانفرنس نے طے کیا تھا کہ ادیب و شاعر اپنی ذات کے نہاں خانوں میں مقیّد رہنے کی بجائے انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کی پاسبانی کریں گے۔ اس کانفرنس کا پیغام تھا: رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا جائے اور فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا جائے۔

پہلی بار دانشوروں نے منظم طور پر اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت کے لیے آواز اٹھائی تھی۔ ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی ایک پارسی خاتون صوفیہ واڈیا نے کی۔ "انگارے" کے قلم کار سجّاد ظہیر بھی ملک راج آنند کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس طرح "انگارے" اور اس کے مصنّفین ترقی پسند تحریک کے بانی ٹھہرے۔

"انگارے" کا فنّی جائزہ

"انگارے" کے قلم کاروں میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، اور محمود الظفر شامل تھے یہ تمام نوجوان ادیب، مذہبی انتہا پسندوں سے اُکتائے ہوئے اور جذباتی طور پر انقلابی تصورات لیے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ تمام نوجوان تغیر پذیر عالمی ادب سے واقف اور تھے اس لیے ان کی کہانیوں میں تازہ کاری اور نئے تجربات کا احساس ہوا۔ یہ تمام نوجوان سماجی نظام کی عفونت اور طبقاتی عدم مساوات کو محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کے سامنے ان مسائل کا کوئی واضح حل موجود نہیں تھا۔ معاشی خوشحالی اور اقتصادی توازن کا فقدان ان کے لیے سوہان روح تھا۔ لیکن شاید اس مجموعے کی اشاعت تک۔ ان ادیبوں کی سیاسی فہم و فراست بالغ نہ ہوئی تھی۔ ورنہ ان کہانیوں میں غلامی کے شدائد، فرنگی حکومت کے جبرو استبداد اور عوامی استحصال کا کوئی عکس کیوں نظر نہیں آتا۔ "انگارے" کی متعدد کہانیوں میں مذہب، مذہبی انتہا پسندی، توہمات اور خدا کے خلاف نعرے سنائی دیتے ہیں۔ کیا آزادی سے قبل کے ہندوستان کے مسائل کا حل مذہب سے بیزاری میں مضمر تھا؟ اس وقت تو اکثر مذہبی علماؤں نے فرنگی حکومت کے خلاف نعرے دیے تھے جمعیۃ العلماء ہند کے تمام علما، جنگ آزادی میں کود پڑے تھے۔ مولانا محمود الحسن کو عرصہ دراز تک مالٹا میں فرنگی قید میں رہنا پڑا۔ علماء نے ایک خفیہ جنگ آزادی "ریشمی رومال تحریک" کے نام سے مولانا عبید اللہ سندھی کی قیادت میں چھیڑی تھی۔ جو بعض وجوہات کی بنا پر ناکام ہو گئی لیکن مذہبی علماء پر بے حسی کے الزام کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے صرف مذہب کو ہدف بنانا ہی کافی معلوم نہیں ہوتا۔ اکثر مقامات پر مذہبی انتہا پسندی اور دقیانوسیت کے بُرے نتائج سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں محض زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈال دینا کافی کیوں سمجھا گیا ہے؟ فرنگیوں کے جبرو استبداد (جس میں اس صدی کا ہولناک المیہ سانحہ جلیانوالہ

باغ بھی شامل ہے) اور جدوجہد آزادی کی لہو رنگ تصویریں اس البم سے کیوں غائب ہیں۔ اسی لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانے ایک طے شدہ نصاب کے تحت لکھے گئے تھے. غالباً وجہ یہی ہوگی کہ اس دھماکہ خیز انداز میں نئے ادب کا تعارف زیادہ موثر رہے گا۔ انگریزی حکومت کے خلاف کوئی افسانہ شامل کرنا خلاف مصلحت سمجھا گیا مبادا یہ مجموعہ ضبط ہو جائے۔ احمد علی نے بھی اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے[1]:۔

"اس تحریک کے اصل بانیوں کے ذہن میں اس وقت کوئی خاص سیاسی و نظریاتی مقصد نہ تھا جب بڑے گرم گرم مباحثوں اور تخلیقی جوش وخروش کے بعد انھوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "انگارے" ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کی بنیاد رکھی، ہمیں یہ خیال ضرور تھا کہ اس کے شائع ہونے پر مخالفت ہوگی لیکن اس بات کا سان وگمان بھی نہ تھا کہ یہ مخالفت اس قدر شدت اختیار کرے گی کہ ملک بھر میں تہلکہ مچ جائے گا۔"

یعنی اس مجموعے کے قلم کاروں نے کافی بحث و مباحثے کے بعد ان افسانوں کو شائع کیا تھا۔ سماج میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے اور نئی افسانوی تکنیکوں سے روشناس کرانا ان افسانہ نگاروں کا نصب العین تھا۔ یہ لوگ سماجی مخالفت کے لیے تیار تھے۔ ان کو احساس تھا کہ سماج میں ان کی مخالفت شہرت کا باعث ہوگی۔

سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے ضمن میں لکھا ہے[2]:۔

"ترقی پسند تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقہ کی جانب ہونا چاہیے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار ورجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود

۱ھ ترقی پسند تحریک اور تخلیقی مصنف۔ سیپ کراچی

۲ھ "روشنائی" سجاد ظہیر ص۷۶-۷۷

رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی
کی جدوجہد اور وطن کے عوام کی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں
صرف دور کے تماشائی نہ ہوں۔"

ایسا نہیں ہے کہ "انگارے" کے مصنفین کو وقت اور ادب کی ضروریات کا علم نہیں تھا لیکن انھوں نے جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کی۔ ان افسانوں میں عصری کرب کا کوئی واضح اظہار موجود نہیں ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی عوام میں طبقاتی کشمکش کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ غیر ملکی حکومت کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہندو مسلم منافرت کی تخم ریزی ہو چکی تھی۔ اس صدی کا پہلا قابل ذکر مسلم کش حادثہ "سانحہ مسجد کانپور" وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ دستکاروں کے استحصال اور روزگار کے عدم مواقع ان کو شہروں کی جانب دھکیل رہے تھے۔ بڑی صنعت کاری اکائیاں قایم ہو چکی تھیں۔ جمشید پور، مودی نگر اور بمبئی کے مضافات میں بڑے پیمانے پر صنعت کاری کی ابتدا کی جا چکی تھی۔ سرمایہ دارانہ صنعت کاری کے ساتھ ساتھ جن برائیوں کا جنم ہوتا ہے وہ استحصال، مزدور کش، سرمایہ دارانہ نظام اور Alienation کی شکل میں ظہور پذیر ہونے لگی تھیں۔ مسلم لیگ کا درخت کافی تناور ہو چکا تھا۔ "ہمارے معاشی مسائل"[۱] کے مطابق :-

"بیسویں صدی کی ابتدا میں ملک کی پینسٹھ فی صدی آبادی کا انحصار زراعت پر تھا جو دوسری دہائی کے آخر تک ۷۳ فی صدی ہو گیا۔ اس زمانے میں صنعتوں پر انحصار کرنے والا طبقہ تقریباً پانچ فی صدی تھا۔ زراعت پر منحصر طبقہ پہلی دہائی میں تین سو کروڑ کا مقروض تھا۔ یہ قرض ۱۹۳۷ء میں اٹھارہ سو کروڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اکثر کسانوں کو تو اس قرض کے بدلے اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔"

---

[۱] OUR ECONOMIC PROBLEMS P. 65

رد عمل کے طور پر ۱۹۱۸ء میں جگہ جگہ کسان سبھائیں قایم ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کو کسانوں کا تعاون نہایت زوردار طریقے پر ملا۔ برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے نے پیدائش کی بنیاد پر ہندو سماج کی تقسیم کی سخت مخالفت کی۔ برہمو سماج کے بعد دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی اور شودروں میں تعلیم پر زور دیا۔ لیکن آزادی وطن تک ہندو سماج میں یہ تفریق کم نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ گاندھی جی نے جب ہریجن لڑکی کے ساتھ کھانا کھایا تو کستوربا گاندھی کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن ان تمام حالات کا عکس "انگارے" کے افسانوں میں نظر نہیں آتا۔ انہی وجوہات اور دیگر فنی خامیوں کی بنا پر ہی "انگارے" کو وقیع ادبی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اور محض تاریخی واردات ہو کر رہ گئی۔ تمام فنی خامیوں کے باوجود یہ بھی اعتراف کرنا ازحد ضروری ہے کہ "انگارے" میں بہت سے اہم پیچیدہ مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ یہ تمام مسائل اب تک اردو افسانے میں کم نظر آتے تھے یا بالکل محروم تھے۔ جنس کا ذکر تو داستانوں میں بھی کافی ہے بلکہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق[1] قدیم افسانوی ادب کے چار بڑے موضوع ہمارے سامنے آتے ہیں اور 'جنس' ان میں سے ایک ہے۔ یوں تو سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی مجموعے "خیالستان" میں جنسی جبلّت کے موضوع پر ایک افسانہ "خارستان و گلستان" ملتا ہے۔ اس افسانے کو سلیم اختر نے[2] اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے۔ پہلی بار اس افسانے میں نسوانی ہم جنسیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو افسانہ رومان پسند افسانہ نگاروں کے زیر سایہ نشو و نما پا رہا تھا اور یہ افسانہ نگار اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود اپنی زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بیزار اور تخیلی حسن کے پرستار تھے۔ ان رومانی افسانہ نگاروں کے

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین صـ۱۶

[2] افسانہ، حقیقت سے علامت تک۔ سلیم اختر صـ۳۲

شانہ بشانہ پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی اور بٹالوی بھی تخلیقی سفر میں شامل تھے بقول پروفیسر قمر رئیس [۱]

"پریم چند کے افسانے ہی اس دور میں اردو افسانہ کا نقطۂ کمال تھے۔ ان میں ہندوستانی سماج بالخصوص گاؤں کی زندگی، ماحول اور مسائل کا حقیقت پسندانہ فنی تجزیہ نظر آتا تھا۔"

"انگارے" کے افسانہ نگار پریم چند کی روایت کا احترام کرتے ہوئے بھی نئے حالات میں اسے کافی نہیں سمجھتے تھے وہ سماجی رشتوں اور ذہنی وجذباتی حقیقتوں کے موثر فنی اظہار کے لیے نئے سانچوں کے متلاشی تھے۔

"انگارے" کے مصنفین میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ "انگارے" سے قبل سجاد ظہیر دو افسانے "جامعہ" میں اور احمد علی کا افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" "ہمایوں، سالنامہ جنوری ۳۲ ۱۹ء میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن باقی تمام افسانہ نگاروں کی اولین کوششیں "انگارے" میں شامل کی گئی تھیں۔

سجاد ظہیر کے پانچ افسانے 'نیند نہیں آتی'، 'جنت کی بشارت'، 'گرمیوں کی ایک رات'، 'دلاری'، اور 'پھر یہ ہنگامہ' شامل ہیں۔ سجاد ظہیر کے یہ افسانے، افسانوی ادب کی جدید تکنیک کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کی ایک خاص طبقے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض ادبی حلقوں میں خیال ہے کہ "انگارے" کی ضبطی کے پس پشت صرف سجاد ظہیر کے افسانے تھے۔ یہ کہانیاں ڈی۔ ایچ لارنس اور جیمس جوائس کے زیر اثر لکھی گئی تھیں۔ جوائس کی بعض کہانیوں میں پلاٹ نہیں ہوتا لیکن اتنی باتیں کہی جاتی ہیں کہ پلاٹ اور کردار کی کہانیوں میں ممکن نہیں ہے۔ متعدد تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل کر قاری کے ذہن پر نقش مرتسم کرتی ہیں۔ کوئی منظر دیکھ کر لکھنے والے کے ذہن میں کسی واقعہ کی تصویر اُبھرتی ہے۔ اس تصویر کے ساتھ ذہن میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں

۱؎ "تنقیدی تناظر" قمر رئیس ص۶۸

پھر انھیں ملے جُلے خیالوں میں سے کوئی خیال اچانک ذہن کو کسی دوسرے واقعہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ ذہن پھر نئے سرے سے خیالات کا ایک سلسلہ بنانا شروع کر دیتا ہے۔ خیالات کا یہ سلسلہ پھر کسی خارجی آہٹ سے متاثر ہو کر نیا منظر سامنے لے آتا ہے۔ سجاد ظہیر کو اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں پہلی بار شعور کی رَو کی تکنیک کو اردو میں متعارف کرایا۔ بعد میں عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کے نہایت کامیاب تجربے کیے۔ اگرچہ اسی تکنیک کی بے حد مبہم اور دھندلی سی شکل پریم چند کے افسانے میں نظر آتی ہے۔

سجاد ظہیر کی کہانی "نیند نہیں آتی" کو مولوی عبدالحق کے سہ ماہی "اردو" نے بے قید اور بے تکان اردو نگاری کا ایک نیا نمونہ قرار دیا تھا۔ ایک شخص رات کی تنہائی میں گم، نیم بیدار اور اپنے آپ میں گم ہے۔ خیالات و تصورات اس کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ وہ اپنی تنگدستی اور مفلسی سے عاجز ہے لیکن سماج اور احباب کی بے اعتنائی کہیں زیادہ سوہان روح ہے اس لیے اس کے خیالات بہ یک وقت اپنے دوست سے گاندھی جی اور جارج پنجم تک پہنچتے ہیں۔ ہم اگر عصبیت سے کام نہ لیں تو خیالات کی یہ رَو بعض اوقات قاری کو اپنی معلوم ہوتی ہے۔ بے مہار رہوار خیال یہاں وہاں جست لگاتا ہے اور بعض اوقات ان وادیوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں داخلہ ممنوع ہے۔ کبھی دوزخ کی سیر کرتا ہے کبھی فرشتوں کی دنیا سے گزرتا ہے۔ فرشتوں کے دامن سے ہی منّی جان طوائف جھانکنے لگتی ہے۔ گاندھی جی کو یاد کرتا ہے تو گاندھی جی کے الفاظ بھی ہو بہو یاد آتے ہیں۔

"پھر یہ ہنگامہ" اور "جنت کی بشارت" میں ان مذہبی رہنماؤں پر طنز کیا گیا ہے جو محض شکم پروری اور مفادات کے لیے مذہبی احکامات کو استعمال کرتے ہیں۔ بہ ظاہر تقدس مآب شخصیتیں حقیقتاً انسانی کمزوریوں کا مجموعہ ہیں اور یہی کمزوریاں ان کو مذہب گزیدہ عوام کا استحصال کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک جنت کا تصور بھی برہنہ حوروں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ "دلاری" ایک مجبور عورت کی کہانی ہے جو حالات کے

ہاتھوں مجبور ہوکر ایک رئیس زادے کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ آخر میں سماج اس مظلوم عورت کو ہی مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ رامش ورنگ کے ایک شہزادے کی نفس پرستی ایک معصوم کی بربادی کا ذریعہ بنتی ہے۔

"پھر یہ ہنگامہ" اور "گرمیوں کی ایک رات" نہایت معمولی درجہ کی کہانیاں ہیں۔

"انگارے" کے اہم ترین افسانہ نگار احمد علی ہیں۔ "انگارے" کے افسانوں میں فنی اعتبار سے مکمل افسانے احمد علی کے ہی ہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری سے قبل ۱۹۲۶ء میں انھوں نے انگریزی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کی اولین انگلش نظم THE LAKE OF DREAM, علیگڑھ میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ احمد علی کے افسانوں کے مجموعے "شعلے"۔ "ہماری گلی" "قید خانہ" اور "موت سے پہلے" شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ایک ناول TWILIGHT IN DELHI اور نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ زیر طبع ہے۔ احمد علی کے ناول TWILIGHT IN DELHI کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انگریزی کے مشہور ناول نگار اور تنقید نگار E.M. Forster ای۔ایم فارسٹر نے اپنے ناول A PASSAGE TO INDIA کے پہلے ایڈیشن میں TWILIGHT IN DELHI کو ہندوستانی تہذیب سے متعلق بہترین ناول قرار دیا تھا۔ "انگارے" میں شامل احمد علی "بادل نہیں آتے" ازدواجی زندگی کے بہت سے تلخ حقائق سے پُر ہے۔ یہ کہانی وقائع نگاری اور صاف گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی دوسری کہانی "مہاوٹوں کی ایک رات" زندگی کی غیر مساوی بخششوں کا شکوہ ہے۔ اس کہانی کا انداز بیان نہایت خوبصورت ہے۔ ایک مفلس عورت اپنے شکستہ مکان میں اپنے معصوم بچوں کے ساتھ موسلا دھار بارش کا مقابلہ کر رہی ہے۔ بچے خوف زدہ ہیں، بچوں کو تسلیاں دیتے ہوئے بھی اس کے دل میں متضاد خیالات لرز کر رہے ہیں۔ وہ عورت لامذہب یا ترقی پسند نہیں ہے لیکن اس کا ایمان متزلزل ہو رہا ہے۔

احمد علی کے افسانے ہمارے اطراف، ہماری گلیوں اور ہمارے ماحول کی محاکاتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مکانوں اور مکینوں، کتّوں فقیروں اور خوانچے والوں کے ساتھ۔

احمد علی نے کرداروں کی ایک ایک حرکت پر مبصرانہ نظر ڈالی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ہمراز ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں تو کرداروں کو عمرِ جاوداں عطا کر دیتے ہیں۔ احمد علی افسانے کی دنیا میں انقلاب لائے۔ انھوں نے موضوع، روایت اور مروّجہ زبان کے شیشوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ایک نئے فن کی بنیاد ڈالی جس میں جدید نفسیاتی محرکات، نئے معاشی نظریوں اور اقتصادی مسائل کا امتزاج تھا۔ مذہبی اور روحانی قدروں کی شکست و ریخت اور پلاٹ، کردار نگاری جیسی فرسودہ چیزوں سے بے نیازی سے افسانوی دنیا میں ایک بھونچال آگیا۔ ان کی تمام کہانیاں ہمارے اردگرد کے ایسے معمولی کرداروں کی کہانیاں ہیں جن سے ہم واقف تو ہیں مگر آگاہ نہیں ہیں۔ اور یہی آگاہ کرنے کا عمل احمد علی کا فن ٹھہرا۔

احمد علی کو اردو افسانے میں یہ بھی اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی زندگی، مسلم خواتین کی ذہنی الجھنیں اور اس طبقے کی عورتوں کی زبان میں ان کے ہی محاوروں میں بیان کیں۔ یہ کارنامہ عام طور پر عصمت چغتائی سے منسوب کیا جاتا ہے عصمت کی کہانیوں میں یہ زبان و بیان نقش ثانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

"انگارے" کی واحد خاتون افسانہ نگار رشید جہاں ایک اشتراکی خاتون تھیں وہ علیگڑھ کی مشہور شخصیت اور عبداللہ گرلز کالج کے بانی شیخ عبداللہ کی صاحبزادی اور مشہور فلم ہیروئن رینوکا دیوی کی ہمشیرہ تھیں اور "انگارے" کے قلم کار محمود الظفر کی شریک حیات تھیں۔ ان کے افسانوں میں پیش کیے جانے والے واقعات کی نوعیت سماجی ہے۔ ان کی حقیقت نگاری کے ڈانڈے پریم چند سے ملتے ہیں۔ "انگارے" میں شامل ان کی کہانی "دلّی کی سیر" کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کا ڈراما "پردے کے پیچھے" میں ایک مسلمان گھر کی اندرونی زندگی کے چند تکلیف دہ حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ بیوی کی صحت کی طرف لا پرواہ نفس پرست شوہر کا گھر اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی تفسیر نظر آتا ہے۔ ؎

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھاجاتی ہے

اس ڈرامے میں بوڑھے مردوں کی جوان عورتوں سے شادی، تعدادازدواج اور سوت کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن ڈرامہ غیر ضروری تفصیلات میں اُلجھ کر بے کیف ہوگیا ہے۔ ڈرامہ کے کردار نے عورتوں کے امراض اتنے مفصّل اور تلذّد آمیز لہجے میں بیان کرے ہیں کہ طب کی کتابوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ ڈرامہ فنی اعتبار سے بے حد کمزور اور بے اثر ہے۔ ابتدا میں ڈرامہ کے کرداروں کا تعارف بھی نہیں کرایا گیا جو ڈرامہ کے اجزا میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو "انگارے" کی زیادہ تر کہانیاں انشائیے معلوم ہوتی ہیں لیکن رشید جہاں کے اس ڈرامے کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ "نسائیہ" معلوم ہوتا ہے۔

رشید جہاں نے "انگارے" کی اشاعت کے بعد بھی کچھ افسانے لکھے۔ "عورت اور دیگرافسانے" میں بھی ان کے تخلیقی شعور کی پختگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ "عورت اور دیگرافسانے" میں بعض افسانے تو سیدھے سادے رومانی افسانے ہیں البتہ ان کا ایک افسانہ "غریبوں کا بھگوان" زن وشوہر کے تعلقات پر کامیاب افسانہ ہے منٹو نے رشید جہاں کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا[۱]:-

> "مجھے اس امر کا شدید احساس ہے کہ اپنے فن کی بقا کے لیے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں اپنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہوگیا اور کچھ پتلون کی جیب میں ٹھنس کر رہ گیا۔"

رشید جہاں نے سماجی زندگی کو محور بنانے کی کوشش کی لیکن مرض کو معالج کی طرح نہیں بلکہ جذباتی بن کر دیکھا۔ یہی ان کے فن کی سب سے بڑی خامی ہے۔ شاختر

۱؎ عصمت چغتائی۔ سعادت حسن منٹو ص۲۶

نے رشید جہاں کے متعلق بہت دلچسپ بات لکھی ہے[1]:۔

"رشید جہاں کے افسانوں کے کردار، تخیلی یا ارتقائی نہیں ہیں۔ انھوں نے کرداروں پر صحیح معنی میں توجہ نہیں دی۔ عام طور پر انھیں صحافتی رنگ پسند تھا۔ اس لیے ان کے افسانے کرداروں کی ظاہری و باطنی زندگی کی کشمکش کو پیش نہیں کرتے۔"

"انگارے" کا آخری افسانہ نگار محمود الظفر کا "جوانمردی" ہے۔ یہ کہانی بھی "انگارے" کی زیادہ تر کہانیوں کی طرح معمولی ہے۔ محمود الظفر کی 'جوانمردی' کے بعد کوئی اور کہانی نظر سے نہیں گزری۔ محمود الظفر نے اصلاً یہ کہانی انگریزی میں لکھی تھی جس کو سجاد ظہیر نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے یہ کہانی محض برائے شرکت لکھی تھی۔

"انگارے" کے افسانوں میں فنی محاسن کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ "انگارے" کے افسانوں نے آئندہ کی رہبری کی۔ اگر "انگارے" کے افسانوں میں بھی جنسی نفسیات اور حقیقت پسندانہ انداز کو نظرانداز کیا جاتا تو منٹو، بیدی، عصمت اور حسن عسکری جیسے افسانہ نگار مطلعِ ادب پر طلوع نہ ہو سکتے تھے۔ اگر دسمبر ۱۹۳۲ء کی سرد صبح یہ "انگارے" نہ سُلگائے گئے ہوتے تو اردو افسانہ کا اس مقام تک پہنچنا بہت مشکل تھا جہاں سورج کی ٹکیہ بہت لال ہو گئی تھی۔

ٹالسٹائی نے لکھا ہے کہ سوال یہ نہیں ہے کہ سنسر اس چیز کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے جو میں نے لکھی ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ سنسر کے عمل کا اس چیز پر کیا اثر پڑے گا جو لکھی جانے والی ہے۔ "انگارے" کی اشاعت پر مسلم پریس کے غیر ضروری احتجاج اور اس کی ضبطی نے "انگارے" کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ کیا لیکن آئندہ افسانہ پر اس کا کافی منفی اثر پڑا۔ اگر "انگارے" ضبط نہ ہو گئی ہوتی تو اسی صدی کی تیسری دہائی میں اردو افسانے کو وہ عروج نصیب ہو جاتا جو آزادی کے بعد ہوا۔ لیکن "انگارے" ضبط ہو جانے

---

[1] "عدسہ"، ش اختر ص ۸۴

کے باوجود بھی اردو افسانے میں حقیقت نگاری اور شعور کی رَو کو متعارف کرنے کا سہرا "انگارے" کے ہی سر جاتا ہے۔

اگرچہ اب شعور کی رَو کی تکنیک کافی قدیم ہے لیکن اس وقت یہ ایک نیا تجربہ تھا ولیم جیمس نے (۱۸۹۰ء) اپنی کتاب PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY میں نفسیاتی اصطلاح کے طور پر "شعور کی رو" کو پیش کیا۔ لیکن بطور ادبی اصطلاح پہلی بار اس نے ایک مضمون ۱۹۱۸ء میں استعمال کیا۔ اس[1] نے یہ جملے لکھے :۔

"وہاں کوئی ڈرامہ نہیں ہے نہ کوئی واقعہ، نہ ہی کوئی جما ہوا منظر، کچھ بھی نہیں۔ بس زندگی جاری وساری ہے، یہ مریم کی شعور کی رَو ہے جو چلتی جاتی ہے مسلسل"۔

یعنی ذہن کا کیمرہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ احساس کے ٹیپ ریکارڈ پر رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ "شعور کی رو" کی تکنیک کو فلسفیانہ اساس برگساں نے حقائق کی جانکاری کے لیے وجدان کا پیمانہ بناتے ہوئے بخشی۔ برگساں کے وجدانی تصورات نے شعور کی رو کی تکنیک کو ایک فلسفیانہ وزن بخش کر ناقدین کی نظر میں اہمیت دی۔ سرریلسٹوں نے براہ راست برگساں سے متاثر نہ ہوتے ہوئے بھی باطن اور ظاہر کی دیواروں کو توڑنے کی کوشش کی۔ اردو میں اس تکنیک کا تعارف "انگارے" کے مصنفین نے کرایا۔

پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے[2] کہ "انگارے کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا غیر رسمی اعلان نامہ تھی"۔ "انگارے کی اشاعت تو غیر رسمی اعلان نامہ تھی لیکن ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ اعلان نامہ بھی "انگارے" کی ضبطی کے جواب میں لکھا گیا محمود الظفر کا مضمون SHALL WE SUBMIT TO GAGGING تھا جو روزنامہ "لیڈر" الہ آباد کی ۵ اپریل ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع کیا گیا تھا۔ اس نایاب مضمون کی بازیافت کے بعد ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ شروعات بھی ۱۹۳۳ء کو تسلیم کرنا چاہیے۔

ھ ۱ ایگوئسٹ EGOIST اپریل ۱۹۱۸ء
ھ ۲ "تنقیدی تناظر" پروفیسر قمر رئیس ص ۸۱

”انگارے“ کے مصنّفین

سجّاد ظہیر

سجاد ظہیر کی وابستگی تخلیقی ادب کی بہ نسبت سیاست سے زیادہ تھی وہ عمر کی آخری گھڑی تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے فعال رکن رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے روح رواں رہے اور ان کی یہی مصروفیات ان کی شخصیت کے ادبی پہلو پر حاوی ہوگئیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سجّاد ظہیر کی سوانح یا خودنوشت حالات بھی دستیاب نہیں ہیں۔ اگرچہ سجّاد ظہیر کا ایک مضمون ”یادیں“ لندن اور پیرس میں ان کے قیام کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہندی کے محترم ادیب راہل سانکرتیان نے ایک مضمون ”سجّاد ظہیر نئے نیتا“ میں کافی تفصیل سے سجّاد ظہیر کے بچپن اور ذہنی نشوونما پر روشنی ڈالی ہے۔ راہل سانکرتیان کے مضمون اور بعض دیگر ماخذوں کی مدد سے سجّاد ظہیر کا سوانحی خاکہ اِس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے:

۵ رنومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ کے مشہور سماجی کارکن اور کامیاب وکیل سر وزیر حسن کے گھر وزیر منزل (لکھنؤ) میں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ جس کا نام سجاد ظہیر رکھا گیا۔ سجاد ظہیر نے اپنی ابتدائی تعلیم جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں ہی حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۲۱ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد

کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے مضامین تاریخ، انگریزی اور فارسی تھے
اُن دنوں وہ ہرکشن ناتھ مشرا اور دوسرے قوم پرست رہنماؤں سے بہت
متاثر تھے۔ وہ کھدّر پہنتے تھے اور گوشت خوری کے ساتھ ساتھ پلنگ پر
سونا ترک کر دیا تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ میں سروزیر حسن کے چھوٹے بیٹے کی ملک
پرستی اور فقیری گفتگو کے مرغوب ترین موضوعات تھے۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں
بنّے بھائی (سجّاد ظہیر) نے انگریزی اور فرانسیسی ادب کے مطالعے پر توجہ
کی۔ اناطولِ فرانس اور برٹینڈ رسل اُن کے محبوب ترین ادیب بن گئے۔
انہی دنوں بنّے بھائی مارکس ازم کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۲۶ء
میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور مارچ ۱۹۲۷ء میں
اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوگئے۔

آکسفورڈ یونی ورسٹی میں بنّے بھائی نے معاشیات اور جدید تاریخ کا
انتخاب کیا۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں زیادہ عرصہ نہ رہ پائے تھے کہ تپ دق نے
حملہ کیا۔ مجبوراً سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم کی راہ لی۔ سوئٹزرلینڈ کے
ایک سال کے قیام کو سجاد ظہیر نے فرانسیسی زبان و ادب کے مطالعے سے
بامعنی بنا دیا۔ انقلاب روس اور کمیونزم پر انھوں نے لاتعداد کتابوں کا مطالعہ
مطالعہ کیا۔ پہلی روسی فلم بھی انھیں یہیں دیکھنے کو ملی۔ ۱۹۲۸ء میں جب وہ
آکسفورڈ واپس آئے تو ذہنی طور پر کمیونسٹ ہو چکے تھے۔ انھوں نے
لندن کی کانگریسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی جس کے اہم ارکان
ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زین العابدین اور محمود الظفر تھے۔ آکسفورڈ میں ہندستانی
طلبا کی انجمن نے ان کو مندوب بنا کر فسطائی کانفرنس میں شرکت کے
لیے فرینک فرٹ بھیجا۔ ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن کے خلاف جلوس نکالنے
کے جرم میں ان کو پولیس کے ڈنڈوں کا نشانہ بنا پڑا۔ ۱۹۳۰ء میں کچھ دوستوں
کی مدد سے لندن سے ایک اخبار "بھارت" جاری کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ

یونی ورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈنمارک، جرمنی، آسٹریا اور اٹلی کی سیاحت کرتے ہوئے ہندستان واپس آگئے اور لکھنؤ سے "انگارے" شائع کی جس کے پانچ افسانے انھوں نے سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران لکھے تھے۔

"انگارے" کی اشاعت کے کچھ ماہ بعد بنّے بھائی اپنی تعلیم مکمل کرنے واپس لندن چلے گئے۔ آکسفورڈ سے بار ایٹ لا کی ڈگری لینے کے بعد سجّاد ظہیر ۱۹۳۵ء میں واپس آگئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی جس کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں کانگریس کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن اور کمیونسٹ پارٹی یو۔ پی کے صوبائی سکریٹری نامزد ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی کی دہلی شاخ کے انچارج نامزد ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں رضیہ سے سجاد ظہیر کی شادی ہوئی ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم میں ہندستانیوں کی شرکت کی مخالفت کے جرم میں گرفتار ہوئے اور دو سال تک لکھنؤ سنٹرل جیل میں قید رہے۔ ۱۹۴۲ء میں جیل سے رہائی کے بعد پارٹی کے اخبار "قومی جنگ" کی ادارت کے لیے بمبئی روانہ ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان جاکر کمیونسٹ پارٹی کی باگ ڈور سنبھالی اور ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں نظر بند ہوئے اور ہند عدالت میں کیے گئے فیصلے کے مطابق چار سال کی سزا سنائی گئی اور بلوچستان جیل میں تبادلہ کیا گیا، ۱۹۵۵ء میں پیرول پر رہا ہوکر ہندستان واپس آئے۔ ۱۹۵۶ء میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے ثقافتی سیل کے انچارج نامزد ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ویتنام اور افریقی ممالک کا دورہ کیا۔

سجّاد ظہیر نے ملک اور بیرون میں متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی جس کی تفصیل یہ ہے : WORLD CONGRESS OF THE WRITERS

FOR THE DEFENCE OF CULTURE

میں شرکت کی	پیرس	۱۹۳۵ء
انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل	لندن	۱۹۳۵ء
انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس، جس کی صدارت پریم چند نے کی	لکھنؤ	۱۹۳۶ء
انجمن کی امرتسر اور الٰہ آباد کی کانفرنسیں		۱۹۳۷ء
انجمن کی دوسری کل ہند کانفرنس	کلکتہ	۱۹۳۸ء
انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس	دہلی	۱۹۴۲ء
آزادی کے بعد انجمن کی پہلی کانفرنس	لکھنؤ	۱۹۴۸ء
ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں ہندستانی وفد کی قیادت	تاشقند	۱۹۵۵ء
انجمن کی تیس سالہ سالگرہ کا جشن	دہلی	۱۹۶۶ء
انجمن کی چھٹی کل ہند کانفرنس	دہلی	۱۹۶۶ء
افرو ایشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس کا انعقاد	دہلی	۱۹۷۰ء
افرو ایشیائی ادیبوں کی پانچویں کانفرنس میں ہندستانی وفد کی قیادت	الماتا	۱۹۷۳ء

اور الماتا (سوویت روس) میں ہی ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو انتقال ہوا۔ اُن کا جسد خاکی دہلی لایا گیا اور جامعہ ملّیہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

بحیثیت صحافی بھی سجّاد ظہیر متعدد اخبارات سے وابستہ رہے:

"بھارت"	لندن	۱۹۳۰ء
"چنگاری"	سہارن پور	۱۹۳۱ء

(محمود الظفر بھی چنگاری سے وابستہ تھے)

"قومی جنگ"	بمبئی	۱۹۴۲ء
"عوامی دور"	دہلی	۱۹۴۹ء
"حیات"	دہلی	۱۹۶۳ء

ادبی تصانیف

۱۔	انگارے	نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۲ء
۲۔	بیمار (ڈرامہ)	جامعہ پریس، دہلی	ء
۳۔	لندن کی ایک رات (ناولٹ)	حلقۂ ادب لکھنؤ	۱۹۴۲ء
۴۔	اردو، ہندی ہندستانی	کتب پبلشرز، بمبئی	۱۹۴۷ء
۵۔	نقوش زنداں (خطوط)	مکتبہ شاہراہ دہلی	۱۹۵۱ء
۶۔	ذکر حافظ (تنقید)	انجمن ترقی اردو، علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۷۔	روشنائی	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۵۶ء
۸۔	پگھلا نیلم (شاعری)	نئی روشنی پرکاشن، دہلی	۱۹۶۴ء
۹۔	میری سنو (خلیل جبران کی PROPHET کا اردو ترجمہ)	اسٹار پبلشرز، نئی دہلی	۱۹۶۷ء
۱۰۔	مضامین سجاد ظہیر	یو۔پی اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۷۹ء

احمد علی

احمد علی ۱۹۱۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونی ورسٹی اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں ہوئی۔ ڈگری کلاسز میں انگریزی ادب ان کا بنیادی مضمون تھا۔ ان کی اولین تخلیق ایک انگریزی نظم THE LAKE OF DREAMS علی گڑھ میگزین ۱۹۲۶ء میں ہی شائع ہوئی تھی۔ حصول تعلیم کے بعد ہندستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں انگریزی ادب کی درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہ وزارت خارجہ سے منسلک ہوگئے اور متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

بعد میں بہت سی غیر ملکی دانش گاہوں میں مہمان پروفیسر VISITING PROFESSOR کی حیثیت سے دورہ کیا۔

احمد علی کی ابتدائی کہانیوں میں دہلی کے روزمرہ اور محاوروں کا بہت صنّاعانہ اور خلاقانہ استعمال ہوا ہے۔ ابتدا میں احمد علی کو خواتین کے مسائل اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کا اولین TWILIGHT IN DELHI (۱۹۴۲ء)، دہلی کے تہذیبی منظرنامے کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ انگریزی کے اہم ناول نگار ای۔ ایم۔ فارسٹر نے اپنے ناول A PASSAGE TO INDIA کے پہلے ایڈیشن میں اس ناول کو بہت سراہا ہے۔ احمد علی کی بیگم بلقیس جہاں نے TWILIGHT IN DELHI کا اردو ترجمہ "دہلی کی ایک شام" کے نام سے کیا جو اردو کے چند بہترین تراجم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

"انگارے" (۱۹۳۲ء) کے بعد احمد علی کی اردو کہانیوں کے چار مجموعے 'شعلے' (۱۹۳۴ء)۔ 'ہماری گلی' (۴۴ ۱۹ء)۔ 'قید خانہ' (۱۹۴۴ء) 'موت سے پہلے' (۱۹۴۵ء) شائع ہوئے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں احمد علی نے ترقی پسند تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اگرچہ سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں احمد علی کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی انانیت، زود حسی اور زود رنجی کو علیحدگی کی وجوہات قرار دیا ہے لیکن احمد علی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ترقی پسند تحریک کے رسالے کی ادارتی پالیسی اور مارکسی نقطۂ نظر سے ترقی پسند تحریک کی روز افزوں وابستگی کے سوال پر اختلافات ہوئے۔

احمد علی کا دوسرا انگریزی ناول OCEAN OF NIGHTS (۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا۔ احمد علی کا دعویٰ تھا کہ یہ ناول انھوں نے ۱۹۴۵ء میں لکھا تھا لیکن جب شائع نہ ہو سکا۔ اس کے بعد OF RATS AND DIPLOMATS ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ احمد علی کا قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ ۸۴ء میں شائع ہوا۔

"انگارے" میں شامل احمد علی کی کہانیوں میں احمد علی کا رویہ ملحدانہ رہا ہے بلکہ انھوں نے کسی حد تک خدا کے تصوّر کی مذاق اڑائی ہے

"...... کیا خدا بھی رحموں کے مجموعے سے بنا ہے؟ آخر رحم میں رحم کو کیوں پیدا کیا؟ عورت کم بخت کی بھی کیا جان ہے......"

(بادل نہیں آتے)

"......خدا محض ایک بہانہ، محض ایک دھوکا ہے....... خدا صرف ایک دھوکے کی ٹٹی....." (مہاوٹوں کی ایک رات)

ان افسانوں کی اشاعت کے وقت احمد علی کی عمر تقریباً ۲۲ سال تھی۔ اس عمر میں اکثر دانشوروں کو تشکیک کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے لیکن ۱۹۸۶ء میں احمد علی نے اپنے مضمون مشمولہ CONTEMPORARY NOVELIST EDITED BY D.L.KIRK PATRICK میں لکھا:

"میں جب دوبارہ زندگی میں لکھنے لکھانے کی طرف واپس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ نظام معاشرت میں جس مَیں سانس لے رہا تھا یکسر مختلف ہو چکا ہے۔ انحطاط کے عمل کا رخ اور طریق کار اپنی جغرافیائی صورت احوال اور سلطنت کے ریاست میں تبدیل ہو جانے کے سبب اپنے مزاج میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور نئی دنیاؤں کی دریافت، وجود کے پھیلنے سے تعصبات کی پیدا کردہ تنگ نظری، خود پرستی، اور رجعت پسندی زندگی میں در آئی ہے۔ ذہنی شعور تو پیدا ہوا مگر طاقت، اقتدار اور دولت کی ہوس کے پاگل پن نے دل کو مار دیا ہے ـــــ اس صورت حال نے مجھے فطری طور پر ایک بالکل ہی مختلف دنیا سے روشناس کرایا، جو تشبیہات اور استعارات سے پُر تھی اور یہ دنیا ہے قرآن کی دنیا،

اور اب تاریخ کی گزرگاہوں کی سیر ہے جہاں قوموں اور
تہذیبوں کے عروج وزوال کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں"

(بحوالہ محترمہ شبانہ محمود۔ لندن)

انسانی ذہن کی یہ تبدیلی اور جست قابل مطالعہ بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ تشکیک سے یقین تک کا یہ سفر احمد علی کی زندگی کا حاصل تھا۔ احمد علی کا انتقال ۱۹۹۳ء میں کراچی میں ہوا۔

رشید جہاں

رشید جہاں ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ کی مشہور شخصیت اور سرسید کے رفیق شیخ عبداللہ کے گھر پیدا ہوئیں۔ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ ہندستانی مسلمانوں کی پہلی آواز ہیں جو تعلیم نسواں کی حمایت میں بلند ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک رسالہ "خاتون" ۱۹۰۴ء میں اجرا کیا بلکہ سرسید کی مخالفت کے باوجود ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ میں لڑکیوں کا اسکول قایم کیا جو علی گڑھ گرلس کالج بنا۔ رشید جہاں نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی، اس کے بعد ازابیلا تھوبرن کالج (آئی ٹی کالج) اور لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی بہرائچ کے صاحبزادہ محمود الظفر سے ہوئی۔ انہی دنوں محمود الظفر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ امرتسر کے قیام کے دوران رشید جہاں کی ملاقاتیں فیض، تاثیر اور دیگر دانشوروں سے ہوئیں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک کا عرصہ رشید جہاں نے دہرہ دون میں سماجی کارکن کی حیثیت سے گزارا۔ ۱۹۴۲ء میں رشید جہاں لکھنو واپس آکر پریکٹس میں منہمک ہوگئیں۔ ۱۹۴۹ء میں ریلوے ہڑتال کرانے کی پاداش میں ان کو تین مہینے کی قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ جیل میں ان کو کئی عارضے لاحق ہوگئے

جو بعد میں کینسر تشخیص ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں اُن کا آپریشن ہوا جو ناکام رہا اور وہ تقریباً معذور ہو گئیں۔ ۱۹۵۲ء میں سوویت یونین کی سرکاری پیش کش پر وہ علاج کے لیے ماسکو گئیں جہاں تین ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور انھیں ماسکو میں ہی کریملن کی دیوار کے سائے میں دفن کیا گیا۔

رشید جہاں کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ "انگارے" کے افسانوں کے علاوہ انھوں نے اپٹا IPTA کے لیے "کاٹنے والا"، "عورت" اور "گوشۂ عافیت" ڈرامے لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "عورت۔ اور دیگر افسانے" بھی شائع ہوا۔

محمود الظفر

محمود الظفر کے والدین کا وطن بہرائچ (یو۔ پی) تھا لیکن وہ رام پور میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ جہاں اُن کے والد غالباً ریاست رام پور سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم کا ذریعہ تعلیم بھی انگریزی تھا، اعلیٰ تعلیم بھی آکسفورڈ یونی ورسٹی میں حاصل کی۔ "انگارے" میں شامل ان کا افسانہ "جوانمردی" کے علاوہ ان کی کوئی اور تحریر نظر سے نہیں گزری، اسی لیے اس اطلاع پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ افسانہ انھوں نے بنیادی طور سے انگریزی میں لکھا تھا، سجاد ظہیر نے اس کو اردو میں ترجمہ کیا۔ ۵۴ء میں ان کا سفرنامہ روس " QUEST FOR LIFE " بمبئی سے شائع ہوا تھا۔

محمود الظفر کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا۔

ضَمِیمَہ

ضمیمہ

انگارے

"انگارے" کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء کا سرورق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَدینہ

یوم دوشنبہ ۱۷ر شوال سنہ ۱۳۵۱ھ

"انگارے"

ایک فحش اور ملحدانہ کتاب

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ اُس نے فرائض صحافت ادا کرنے کے لئے ہمیں ایک ایسی بستی میں اقامت گزیں ہونے کا موقعہ دیا ہے جو دور فساد اور تہذیب و حضارت کے تقویٰ شکن اور ایمان فرسا عناصر سے محفوظ ہے جہاں نہ شعر و شباب کی رنگینیاں خرمن صبر و ثبات پر بجلیاں گراتی ہیں نہ حسن و جمال کی محشر آرائیاں شیرازۂ ایمان کو درہم برہم کرتی ہیں اور نہ الحاد و زندقہ کی تند اور تیز ہوائیں گلشن دین و ایمان کو جھلس سکتی ہیں۔ ع

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

ہماری مختصر دنیا میں نہ تھیٹر ہیں نہ سنیما۔ نہ رقص و سرود کی محفلیں ہیں نہ الحاد و زندگی کے ہنگامے۔ نہ مذہبی دل آزاری کی مذموم کوششیں ہیں اور نہ ہماری محبوب متاع ایمان کو لوٹنے کے لئے رہزنوں اور چوروں کی بھیڑ، بحمداللہ ہم دنیا کی نحوستوں سے بڑی حد تک محفوظ ہیں لیکن افسوس کہ صحافت کبھی کبھی ہم کو اہل زمانہ کی بعض دل آزار شرارتوں سے واقف کرتی ہے جن سے واقف ہونے کے بعد ہمارے لئے صبر و ثبات کا دامن تھامنا دشوار ہو جاتا ہے۔

ایک جدید لغویت

ابھی کل کا واقعہ ہے کہ مذہبی دنیا میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے نگار اور صاحب نگار کی صبر آزما تحریروں کی طرف توجہ دلا کر ایک ہنگامہ کرب و اذیت برپا کر دیا تھا۔ مولانائے محترم کے حساس دل کو مولوی نیاز فتحپوری کی شرارت آمیز تحریروں سے جو کرب و اذیت پہنچی تھی اُس کو اُنھوں نے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور ہم کو بھی علیٰ قدر مراتب اس میں سے حصہ ملا، اور ہم نے محسوس کیا کہ اب انسان کی گمراہی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور ترقی کے ہزاروں شعبے نامکمل چھوڑ کر اس امر کو ضروری محسوس کرتا ہے کہ مذہبی دنیا کے نازک حسیات کو ٹھیس لگائے اور ایک ایسے مشغلہ میں مصروف ہو جس سے دنیا و آخرت کی کوئی بھلائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ہنگامے کی صداہائے بازگشت بھی ابھی ناپید نہیں ہوئی تھیں کہ مرزا ابراہیم بیگ چغتائی کا "امر عظیم" سامنے آگیا۔ اور ابھی اُن کی آمادگیٔ اصلاح سے فضا کی تلخی بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ دل مذہب کے زخم خوردہ قلوب کو نیز نشتروں سے کریدنے کے لئے ایک اور فتنہ سامنے آگیا اور ہم سوچنے لگے کہ ارحم الراحمین کیا اب دنیا میں ان لوگوں کو امن و عافیت سے نہیں رہنے دیا جائیگا جو اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا ہے، اس کا سلسلۂ رسالت ایک حقیقت ہے نبوت ایک واقعہ ہے۔ شریعت ہی علاج انسانی فلاح و نجات کے لئے لازمی ہے، نجات آخرت ایک [illegible] اور تقوی و طہارت کے بغیر انسان کی دنیوی اور اُخروی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی

انگارے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ معاصر سرفراز نے ایک اخلاق سوز اور شرافت ربا کتاب کا تذکرہ کیا ہے جس کا نام "انگارے" ہے یہ کتاب سید سجاد ظہیر صاحب خلف خشص سید وزیر حسن صاحب جج اودھ چیف کورٹ نے لکھی ہے۔ نظامی پریس لکھنؤ نے اس کو "زیور طبع" سے آراستہ کیا ہے۔ اس میں سجاد ظہیر صاحب نے اس کتاب میں لکھی ہیں اور دو تین دوسرے حضرات نے ہمیں [illegible] کیا ہے۔ [illegible] اس کتاب میں کیا ہے۔ [illegible] سرفراز نے کیا ہے لیکن افسوس کہ [illegible] نہیں [illegible]

سزا ہے اُن کے اعمال کی جو وہ اور اُن کے ہمعصر بھگت رہے ہیں۔

اشتعال پذیری سے اجتناب

اس مسئلے کا دوسرا پہلو بھی مذکورہ بالا پہلو سے کم اہم نہیں۔ وہ دل
مذہبی تربیت تو زمانۂ مستقبل سے تعلق رکھتی ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں
کہ کم از کم ہماری آئندہ نسلیں اس قسم کی بداخلاقیوں کا ارتکاب نہ کریں
تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کے سدباب کی کوشش آج ہی کو شروع کر دیں
لیکن مستقبل کا حسن مستقبل کو دو۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ
نوجوان نسل کی بدتمیزیوں کا کیا علاج کیا جائے اور یہ جو مذہبی جذبات
کو برانگیختہ کر کے بہرہ اندوز مسرت ہونے کا تفریحی طریقہ اختیار کر لیا گیا
ہے۔ اسکا جواب کیا ہونا چاہیئے۔ اسکا ایک علاج قانونی چارہ جوئی
ہے جس کے ہم بحالات موجودہ قائل نہیں ہیں۔ دوسرا علاج
معاشرتی ہے لیکن ہمارا مذہبی نظام اتنا کمزور ہے کہ اس کو اس غرض
کے لیئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لے دیکر صرف ایک صورت
باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جو "زندہ دل" نوجوان ہماری
مذہبی کمزوریوں" سے تفریحی حظ حاصل کرنا چاہتے ہیں ہم اشتعال
پذیری سے اجتناب کر کے ان کے مقاصد کو ناکام کر دیں۔ کچھ بدتمیز
اور بدوضع لوگ یہ دیکھکر کہ ایک شخص بعض چیزوں سے کھسیاتا ہے
اور بلا کر ان کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور اس کی بدحواسی اور کھسیاہٹ
سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اس قسم کی
لغویتوں کو دیکھ اور سن کر اپنے اشتعال طبع کے اظہار سے باز رہنے
کی ہمت پیدا کرے تو ہمارا خیال ہے کہ مذہبی دل آزاری اپنے تفریحی
اثر سے محروم ہو کر اپنی تمام جدت کھو دیگی۔ قرآن مجید میں بھی ان
لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو خدا اور اسکی آیات سے استہزا کرتے
تھے۔ ان کے متعلق ارشاد ربانی یہ ہے کہ ان سے اجتناب کرو۔
اور ایسی مجالس سے علیحدہ ہو جاؤ۔ ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بڑی
مشکل بات ہے اور اپنے جذبات پر قابو رکھنا عزم سوز ہے لیکن
اصل تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں رہی اور دوسرے
وہ وقت آرہا ہے کہ اہل مذہب طوعاً او کرہاً سکوت اختیار کرنے پر
مجبور ہوں گے۔ بہرحال ہم نے اس مسئلے کے متعلق اپنی تجاویز پیش
کر دی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے مسلمان بھی اس پر غور کر کے
کوئی فیصلہ کریں۔ اس لئے کہ معاملہ اب محض الحاد و زندقہ کے مسئلہ
کا نہیں ہے بلکہ اخلاق و شرافت کی تباہی کا ہے اور اس کی طرف سے
زیادہ دیر تک اغماض نہیں کیا جا سکتا۔

"مدینہ" بجنور

۱۳ فروری ۱۹۳۳ء

۲

آگ دیکھی۔ پانی دیکھا اور انگارے دیکھے

بجلی اور پانی سب ہی نے دیکھا
اور خوب دیکھا۔ لیکن انگارے کم حضرات نے دیکھے۔ نمائش کے خاتمہ کی شام مجھکو
چند محترم احباب یونیورسٹی بک ڈپو میں لے گئے جو امسال نمائش میں آئی تھی۔ یہاں
بہ کثرت رسائل و اخبارات کے سالنامے اور رسوائے انام کتاب موسومہ انگارے
بھی برائے فروخت رکھی تھی۔ ان محترم بھائیوں نے اس گندے لٹریچر کا ایک صفحہ
کھول کر ہم کو دیا کہ ہم بھی پڑھیں۔ دو چار سطریں پڑھنے کے بعد نفرت مطلق کلام
نہیں کیا۔ دماغ گرم ہو گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ گندی کتاب ہاتھ سے
چھوٹ گئی۔ نمائش گاہ سے مکان واپس آئے۔ پلنگ پر لیٹ گئے۔ طرح طرح
کے خیالات دل و دماغ میں آتے رہے تحریرات کی سیاہی کے ساتھ دل کی بےچینی
طرح بڑھتی گئی۔ لیکن سردی کے ساتھ دماغ کی گرمی کم ہوتی گئی۔ دماغ ٹھنڈا

مدیر سرفراز کی وہ بہت ان جملہ خرافات شرمناک اور اخلاق سوز فقرات کا، جادو گر بھی جو اس نوجوان مسلمان کے دماغ اور قلم نے انتہائے بے تکلفی و ستم ظریفی سے صفحۂ قرطاس پر منتشر کر دیئے ہیں اور جن کو نقل کرنے کا حوصلہ مدیر سرفراز نے خدا جانے کہاں سے حاصل کر لیا ہم ذرا بڑی ہمت اور جرات کر کے سرفراز کے بیان کئے ہوئے فقرات پڑھے۔ ان میں ہمیں بجز بد اخلاقی، بد مذاقی، اور بد قماشی کے اور کوئی ذہنی یا دماغی جدت نظر نہیں آئی۔ خالق کائنات کا مذاق اڑانا، مذہبی عقائد سے استہزا کرنا اور اخلاق سے گری ہوئی پھبتیاں کسنا اس گندگی کی پوٹ کی خصوصیات ہیں۔ اس میں نہ خدا کی عظمت و جلالت کا لحاظ کیا گیا ہے نہ انبیاء کی عزت و حرمت کا پاس کیا گیا ہے۔ [illegible] انسانی شرافت ہی کا خیال کیا گیا ہے بلکہ پوری بے باکی سے ہر نوع کی بد زبانی کی گئی ہے۔

نیاز فتح پوری کی "نقوش نگاری" میں ادبیت کا ایک خفیف عنصر ضرور موجود تھا لیکن افسوس کہ ان انگاروں میں ادبیت، فن افسانہ نگاری یا دماغی نظافت کی بھی کوئی چمک موجود نہیں اور اسکا مقصد تصنیف بجز افسانہ نگار کی خرابئ تربیت کا مظاہرہ کرنے کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

چند سوالات

معاصر سرفراز نے اس کتاب کا تذکرہ کر کے بلاشبہ ایک بہت بڑی دینی خدمت سرانجام دی ہے اور اس کا یہ مشورہ بھی بالکل صحیح ہے کہ اسے مذہبی دل آزاری کے قانون کے ماتحت ضبط کرا دینا چاہئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ مذہبی دل آزاری کی برائی اب محض قانونی چارہ جوئی اور ضابطہ کی خانہ پری سے آگے بڑھ چکی ہے اور اب مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ اس قسم کی کوششوں کا سدباب کس طرح کرنا چاہئے۔ اور اگر اس کا سدباب نہیں کیا جا سکتا تو اپنے صبر و ضبط کا کیا انتظام کیا جائے اور اپنے مذہبی جذبات کی دنیا کو کس طرح تباہ ہونے سے بچایا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز یہ معلوم کرنا ہے کہ اس قسم کی [illegible] کے اسباب نمود کیا ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ اس قسم کی دل آزار اور فحش تحریریں زیادہ کثرت سے شائع ہونے لگی ہیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی چیز بازار میں مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لئے نمودار ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر سبب حقیقی کا علم ہو جائے تو اس کے سدباب کی کیا تدبیر ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ اگر حکومت موجودہ کے نظام آئین میں مذہبی اور اخلاقی گمراہی کی روک تھام کے لئے کوئی تدبیر موجود نہیں ہے تو مذہبی دنیا کو اپنے جذبات کی حفاظت کے لئے کیا صورت اختیار کرنی چاہیئے۔

مذہبی تعلیم کی ضرورت

مذہب اور ارکان مذہب کے استہزاء کے متعلق "انگارے" پہلی کوشش نہیں ہے اس سے قبل بھی مختلف حضرات نے اسلامی اصولوں کی تضحیک پر مبنی تحریریں شائع کی ہیں۔ لیکن انکا موضوع تحریر کم از کم ظاہری اعتبار سے تحقیق مذہب تھا۔ اور ان کے سموم اثر کو زائل کرنے کے لئے بحث و مناظرہ اور استدلال کا طریق اختیار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ "نگار" کی خرافات کے بارے میں اس طریق عمل کو آزمایا گیا اور ہمارے اندازے کے مطابق وہ کامیاب ہوا۔ لیکن جس قسم کی کہانیاں "انگارے" کے نام سے شائع کی گئی ہیں ان کا مقصد اصلاح یا تحقیق نہیں ہے بلکہ محض استہزاء و تضحیک اور جذبات مشتعل کر کے ہیجان پیدا کر کے ایک ہنگامۂ شہرت و تشہیر برپا کرنا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "انگارے" کے لفظ میں "نگار" کا تلازمہ موجود نہیں ہے اور کیا عجب ہے کہ "فحش نویسی" کا یہ شرمناک مظاہرہ "نگار" کی تحریک الحاد ہی کی ایک کڑی ہو۔۔۔۔ اگر ایسا ہے تو اس کتاب کی تصنیف کا مقصد اہل مذہب کے اشتعال پذیر جذبات کو برانگیختہ کر کے ان کے رقص مذبوحی کا لطف اٹھانا ہے جب حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ خدا، انبیاء، ملائکہ، ارکان مذہب اور اصول اخلاق کی تضحیک محض "لطف اندوزی" کے لئے کی جائے تو سوچنا چاہیئے کہ خرابی کی بنیاد کیا ہے اور اسکا علاج کیا ہے۔

ہماری رائے میں یہ صرف ان نوجوانوں کی تربیت کی خرابی ہے جو اخلاق اور شرافت سے بالکل منہ موڑ چکے ہیں اس لئے کہ تہذیب شرافت کی کوئی تعبیر اور کوئی صورت دل آزاری اور ہیجان انگیزی کو پسند نہیں کرتی اور جب یہ صرف خرابئ تربیت کا نتیجہ ہے [illegible] بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ حقیقت میں اصل قصور سید سجاد ظہیر کا نہیں بلکہ ان کے نامور و بلند مرتبہ والد کا ہے جنہوں نے اپنے ناخلف بچے کی تربیت کا صحیح انتظام نہ کیا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ ہمارے والدین اور ان کے ہم عصروں کی غفلتوں کا نتیجہ ہے۔ [illegible]

ہوتے ہی دل بھی ٹھکانے ہوا۔ طبیعت میں سکون ہوا۔ پھر خود بخود یہ خیال آیا کہ اللہ پاک و برتر کا حکم اٹل ہے۔ ہادیٔ برحق کا فرمان لفظاً بہ لفظاً صحیح ہے قیامت کا آنا برحق ہے۔ آثار پورے پورے موجود ہیں۔ تمہاری سلطنت نہیں کہ کسی کو دار پر کھنچوا دیا جائے۔ شریعت کا دور نہیں کہ سنگسار کرا دیا جائے یا درّے بازی ہو۔ آزادی کا زمانہ اور قانون نافذ الوقت کا دور دورہ ہے حکومت کا فرض ہے کہ وہ عدالت مجاز سے چارہ جوئی کرے اور نمایندگان قوم کا فرض ہے کہ کونسل اور اسمبلی میں چیخ پکار کریں۔ تمہارا فرض صرف اس قدر ہے کہ تم اگر دعویدار اسلام ہو تو اسلام کا صحیح نمونہ اپنے عمل سے پیش کرو۔ کیونکہ اسلام وہ روشنی ہے جو ظلمات کی دشمن ہے۔ ہم اگر اس اسلام کے عامل ہوتے تو آج یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ اس میں ان کا قصور کم اور اپنا قصور ان سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ حضرات جو اس گندے لٹریچر سے متاثر ہیں ان کا بھی فرض اب یہ ہے کہ حقیقی اسلام کا نمونہ بن جائیں۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو اپنے تو اپنے غیر گرویدہ ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اسی طرح زبانی دعوے ہی رہے تو غیر تو بہت دور ہیں اپنے بھی اسی طرح نکلتے جائیں گے اور عذاب ہوتے جائیں گے اسلام وہ دولت ہے جس نے جانوروں کو انسان بنایا۔ دشمنوں کو دوست اور غیروں کو بھائی بنایا ہے۔ اے کاش ہم مسلمان ہو جائیں ناممکن ہے کہ پھر یہ واقعات رونما ہوں۔ اس وقت ذمہ دار ہیں تو ہم ہیں اور قابل نفرین ہیں تو ہم ہیں۔ اس وقت "انگارے" پیش کرنے والے حضرات نے اسلام کا کوئی نقصان نہیں کیا ہے البتہ اپنے مشن کا بہت بڑا نقصان کیا ہے کہ تہذیب و تعلیم کے دعویدار ہو کر اچھے لٹریچر اور اعلیٰ خیالات پبلک کے سامنے پیش کرنے کے نہایت گندا لٹریچر اور بہت ہی رکیک خیالات پیش کئے ہیں جس کی داد ان کی جماعت بھی نہیں دے گی بلکہ خود جل کر خاک ہو جائے گی۔

(نوٹ) اس گندی کتاب کا خریدنا یا اقتباس دینا گناہِ عظیم ہے۔ اس کو فوراً ضبط کرا دیا جائے اور اسلام کا نمونہ عملاً پیش کیا جائے۔

(سرگذشت)

۲۴ فروری ۱۹۳۳ء

۳

انگارے!

حال ہی میں اس نام کی ایک کتاب شایع ہوئی تھی جس نے ارباب حل و عقد کے دماغوں کو پریشان کر رکھا ہے اخباروں کے ہاتھ ایک اچھا

مشغلہ سنسنی خیزی کا آیا۔ اور کفر گڑھنے کے کارخانے ایکمرتبہ پھر جاری ہو گئے ہیں

ہمیں بھی اس کتاب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں تک طرزِ نگارش کا سوال ہے ہم بھی اس کتاب کو لائق ملامت سمجھتے ہیں۔ عریاں نویسی کسی حالت میں جائز نہیں اور یہ طریقہ کسی حالت میں مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ علاوہ بریں اکثر افسانے جذبۂ شہوت پرستی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اور یہ ذہنیت روشن خیالی نہیں بلکہ نفس پرستی کا ثبوت دیتی ہے۔ بہ این ہمہ ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلہ میں علمائے کرام کا رویہ حد درجہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ کفر و الحاد کا جواب لعن و طعن منبطی اور مقدمہ بازی ہرگز نہیں ہے۔ کتنا ستم ہے کہ جو لوگ گورنمنٹ سے آزادی رائے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ خود اپنے ہم قوموں کو یہ آزادی نہیں دینا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آگ اندر اندر سلگتی رہتی ہے اور موقع ملتے پر یکایک بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر حقیقت علمائے کرام کیسا تھ ہے تو وہ کفر و الحاد کے ایک وار سے کیوں اس طرح تلملا اٹھتے ہیں۔ اگر عوام کے ایمان کی یہ حالت ہو۔ کہ کچھ لوگوں کے بہکانے میں آجائیں تو یہ بار گناہ علماء کے سوا اور کس کے سر رکھا جائے۔ لا مذہبیت کا مقابلہ اب اُن فرسودہ ہتھیاروں سے نہیں ہو سکتا۔ جب انسان جواب نہیں دے سکتا تو ناراض ہو جاتا ہے۔ جھلاتا اور بگڑتا ہے۔ جبر و غضب کچھ مدت کے لئے معترض کو خاموش کر سکتا ہے لیکن سوال اپنی جگہ موجود ہے انسانی دماغ کا ارتقا تجسس کی راہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ یہ کوشش بیکار ہے

امید ہے کہ "انگارے" کی تہ میں جو شعلہ پنہاں ہے اکابر ملت اسکا تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کرینگے۔

"پیام" علی گڑھ

۵ مارچ ۱۹۳۳ء

۴

شرمناک کتاب

"ایک شرمناک کتاب" پر جو نوٹ مسٹ میں نکلا
تھا، اُسکے بعد حقیقت، حق، وغیرہ چند اور اخبارات میں بھی اس کتاب پر مضامین
نکلے، اور متعدد مقامات پر برہمی کے جلسے ہوئے، یہاں تک کہ صوبہ کی کونسل میں
حافظ ہدایت حسین صاحب نے اسکی ضبطی سے متعلق سوال بھی کر دیا۔ سچ کے
اس نوٹ کو پڑھ کر ایک اہل قلم، سچ کے کرمفرما لکھتے ہیں :-

[مصنف] کی شخصیت، انکی انشا پردازی، انکی اصابت، ...
کسی چیز سے بھی قوم واقف نہ تھی۔ نہ کتاب شایع ہونے سے پیشتر
نہ کتاب شایع ہونے کے بعد۔ زیادہ سے زیادہ انکی کتاب چند
نکلتی، لوگ صفحہ ڈیڑھ صفحہ دیکھتے، خود ہی بند کر کے رکھ دیتے، اسلئے
کہ وہ صرف غیر معروف و ناقابل توجہ شخص کے افسانوں کا مجموعہ تھی
اُسکی سوقیت اتنی عام ہے کہ غالباً کوئی بھی اس طرف توجہ نہ کرتا
لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ مصنف کا مقصد حاصل ہو گیا، انھیں
سب جان گئے، انکی کتاب کا پریس میں اتنا چرچا ہوا، کہ اگر وہ ہزار
روپیہ اشتہار پر صرف کر دیتے، جب بھی نہ ہو پاتا۔ یہی انھیں چاہئے
تھی انھوں نے پالیا۔ افسوس جو چیز محدود تھی، وہ عام ہوئی۔ مشتاق
نگاہوں سے دیکھی جائیگی۔ انکی کتاب پر اسلامی پریس نے جو احتجاج
کیا، اُس پر میری یہ حقیر رائے تھی جو میں نے مسودا نہ آپ کی خدمت
پیش کر دی۔ آپ کے مکتوب گرامی سے میں نے خیال کیا تھا، کہ
آپ انھیں ناقابل التفات سمجھ کر سچ میں انکا تذکرہ نہ فرمائینگے،
سر... صاحب کے صاحبزادے ہیں، اسلیے بعض حلقوں میں ا

پا جاتے ہیں، ورنہ انکا اصلی مقام تو وہ تھا، جہاں لکھنؤ کے ا
آوارہ گرد لوگ گھوما کرتے ہیں۔ وہی زبان، وہی طرز ادا، وہ
پستی خیال، وہی سوقیانہ اور عامیانہ استدلال۔ اور میں تو یہ سمجھ
ہوں کہ یہ افسانے فن کے اعتبار سے بھی حد درجہ لغو و مہمل ہی
مراسلہ نگار نے جو رائے ظاہر کی ہے، بالکل صحیح ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے
کی شخصیت، بجز رسالہ جامعہ کے صفحات کے، ساری دنیا کیلیے گمنام دا
ہے۔ مدیر سچ کو اسی لیے ابتداءً قلم اٹھانے میں تامل رہا تھا لیکن
میں چیز عام ہو چکی تھی، اور جس چیز کا اندیشہ تھا، وہ واقعہ بن چکا تھا
خاموشی کے کوئی معنی نہ تھے، اس لیے لکھنا ناگزیر ہوگیا۔ پھر بھی اس ا
لکھا گیا، کہ نہ مصنف کا، نہ تصنیف کا، کسی کا بھی اشتہار نہ ہونے پا
مخلص ایسے ہیں، جو جوش میں آکر ہوش سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں،
ومقاصد کے درمیان توازن نہیں قائم رکھ سکتے۔ بہرحال جو کچھ ہوا
اور حافظ ہدایت حسین صاحب کی حمیت دینی قابل داد ہے، کہ انھوں
کے ذریعہ سے موثر قانونی کارروائی کر ڈالی۔ "حافظ" کے لفظ سے یہ خیا
کہ موصوف کسی مسجد کے حجرہ میں رہنے والے پرانے قسم کے "حافظ جی"
وہ بی اے ہیں، بیرسٹر ہیں، بار بار کے یورپ دیدہ اور صاحب رسید
خان بہادر ہیں، سی، آئی، ای ہیں۔ "صاحب" کے ہاں خاص عزت
رکھتے ہیں، لیکن اس پر دین کی یہ حمیت و غیرت ہے! جزاہ اللہ
اس سے قبل فتنہ نگار کے معاملہ میں بھی موصوف ایسی ہی ہمت
کا اظہار کر چکے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

"سچ" لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء

۵

ایک شرمناک کتاب

لکھنؤ کے ایک شیعہ نوجوان' اور ایک نسیقہ اور دو رفیقوں کے نام سے ایک مختصر مجموعہ چند افسانوں کا حال میں شایع ہوا ہے۔ زبان بازاری اور گندی' اور طرز بیان بالکل ہی عامیانہ و مبتذل۔ جا بجا مذہب پر بھی اسی قسم کی بازاری پھبتیاں ہیں۔ کوئی ادبی حُسن تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا۔ البتہ زبان و انشا کی موٹی موٹی غلطیاں بکثرت۔ کتاب اس قابل بھی نہیں، کہ شریفوں کے مجمع میں اُسکا نام لیا جائے۔ مذہب پر حملوں کو دیکھ کر سب سے پہلے لکھنؤ ہی کے ایک شیعہ اخبار سرفراز نے پُر زور احتجاج کیا، اور مقام مسرت ہے، کہ صاحب مطبع نے فوراً اپنی غلطی و غفلت کا اعتراف کرلیا۔ لیکن نوعمر مصنف (جو پبلشر بھی ہیں) شاید ہندوستان سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ لکھنؤ میں کتاب کے خلاف اچھی خاصی برہمی پھیل چکی ہے اور عجب نہیں کہ ان سطور کے شایع ہونے تک مظاہرے بھی شروع ہو جائیں۔ برہمی اب شیعہ جماعت تک محدود نہیں رہی باہر کے اخبارات میں خلافت لکھ رہا ہے، رسالہ معارف نے لکھا ہے، اور لکھنؤ کے اخبارات میں بھی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ مطالبہ یہ ہے کہ کتاب مذہبی حیثیت سے نہایت دلآزار ہے' اس لیے ضبط ہو جانی چاہیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ مذہبی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کتاب اخلاقی حیثیت سے گندی اور گھناؤنی ہے۔ مذہب پر حملے تو کہیں کہیں ضمناً آگئے ہیں، لیکن شرافت، تہذیب و اخلاق پر حملے تو مسلسل اول سے آخر تک ہیں' اور کسی مذاق سلیم رکھنے والے کے لیے بھی، خواہ اُسکے عقائد کچھ بھی ہوں، کتاب کا مطالعہ آسان نہیں۔ تعزیرات ہند میں آخر ایک دفعہ فحش نگاری سے متعلق بھی تو ہے' اگر ایسی گندی کتاب بھی اس دفعہ کے تحت میں نہیں آسکتی، تو خود وہ قانون قابل ترمیم ہے۔ کتاب کی ضبطی کا مطالبہ یقیناً صوبہ کی حکومت سے جاری رکھنا چاہیے، لیکن بجائے مذہبی دلآزاری کے' عریاں نگاری

و مخش پروری کے تحت میں۔ نوعمر مصنف کا خاندان، سادات کرام کا ایک مشہور و معزز خاندان ہے۔ مصنف کے والد، صوبۂ اودھ کے سب سے اعلیٰ عہدہ دار ہیں اور مصنف کے ایک بڑے بھائی صوبہ کونسل کے ممبر شہر کے میونسپل کمشنر، اور اودھ کے شاید سب سے زیادہ کامیاب بیرسٹر۔ ان ارکان خاندان کے دلوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی، اسکا اندازہ ہر شریف انسان اپنی حالت پر قیاس کر کے کر سکتا ہے۔ یہ بیچارے اسوقت قابل ہمدردی ہیں، نہ کہ موجب لعن و طعن۔ بری صحبتیں آخر کار شریف سے شریف خاندانوں کو بدنام کر کے ہی رہتی ہیں۔ انا للہ۔

"سچ" لکھنؤ۔ ۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء

۶

ایک خبر سے متعلق دوسرا بیان

سچ ملا میں، ایک نہایت معتبر و مستند اطلاع کی بنا پر یہ خبر غصہ و التہاب کے ساتھ شایع ہوئی تھی، کہ لکھنؤ کی گندی و شرمناک کتاب، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ایک استاد، بہ طور خود، فروخت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس پر یونیورسٹی کے ذمہ دار حکام کو بھی خطوط میں توجہ دلائی گئی تھی۔ اب یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے، کہ

"تحقیقات سے معلوم ہوا، کہ جو اطلاع آپ کو ملی، صحیح نہ تھی"

یہ تحقیقات اگر صحیح ہے تو اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کتاب کی ضبطی کا باقاعدہ اعلان بھی اب عرصہ ہوا ہو چکا ہے، اس لیے اب تو بھی کسی کو اسکے فروخت کرنے کی جرأت مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔

"سچ" لکھنؤ۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۳ء

گندگی کا ایک قدرداں

(از عبدالماجد)

"کاش کہ ہمارے بال بھی کٹتے ہوتے، گُندی تو ملی جاتی ہے، تُھلسی جاتی ہے۔ اس پر بھی بال نہیں کٹوا سکتے!.... اگر میں کہیں لڑکا ہوتی تو کلموندی چُھری سے کاٹ ڈالتی، جڑسے اُڑا ڈالتی، اور جب ناک ہی نہ رہتی، تو کٹنے کا ڈر کہاں؟ خدا کنجے کو نا خون ہی نہیں دیتا۔ زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بھر آئیں گے کیا؟ زخم تو بھر آیا۔ لیکن ناخون ہی نہیں، جو زخم زخم —— رحم ارحم الراحمین۔ کیا خدا بھی رحموں کے مجموعے بنا ہے۔ آخر ہم ہی میں رحم کو کیوں پیدا کیا؟ عورت کمبخت ماری کی بھی کیا جان ہے، خچر سے بدتر۔ کام کرے، کاج کرے، سینا پرونا، کھانا پکانا... اور اس پر طرہ یہ کہ بچے جننا۔ جی چاہے یا نہ چاہے جب میاں ہوے کا جی چاہا، ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ ادھر آؤ، میری جانی، میری پیاری۔ تمھارے نخرے میں گرم مصالح۔ دیکھو تو کمرے میں کیسی ٹھنڈک ہے، میرے کلیجہ کی ٹھنڈک! ورے آؤ، بڑو پرے۔ تم پر ہر وقت کمبخت شیطان ہی سوار رہتا ہے۔ نہ دن دیکھو نہ رات۔ ہاے۔ مار ڈالو۔ کٹاری مار دو نا۔ ہاتھ نگوڑا مروڑ ڈالا۔ کہاں بھاگی جاتی ہو؟ سینے سے چمٹ کے لپٹ جاؤ۔ دیکھو کٹاری کا مزا چکھ لو!" (صفحہ ۲۷-۳۰)

اتنی عبارت تو خدا معلوم کس طرح دل پر جبر کر کے، اور یہ دعائیں مانگ مانگ کر، کہ خدا نہ کرے ان ٹکڑوں پر کسی شریف گھرانے کے لڑکوں اور لڑکیوں کی نظر پڑے، نقل کر دی گئی لیکن اس کے بعد کے جو فقرے ہیں، وہ گندگی اور عریانی میں اتنے بڑھے ہوے ہیں کہ انکی نقل کی ہمت کسی طرح بھی نہ پڑی۔ یہ اقتباس کس کتاب کے ہیں؟ اُسی گندی اور شرمناک کتاب کے جس کا ذکر ان اوراق میں، بغیر مصنف اور تصنیف کی نام کی تصریح کے، دوبارہ آچکا ہے — اور جو اس وقت تک انشاءاللہ یو۔ پی۔ میں منشی ہدایت حسین صاحب ممبر کونسل کی غیرت ایمانی کے طفیل، ضبط بھی ہو چکی ہوگی۔

۱۳۴ صفحہ کی گندگی کی اس پوٹ کے لیے موزوں جگہیں صرف دو ہوسکتی ہیں۔ یا تو ان کا غذی انگاروں کو آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا جائے، اور یا انھیں ہاتھ سے پارہ پارہ، اور پیر سے مسل کر کرکے، آبادی کے باہر ان مقامات پر پھینکوا دیا جائے، جہاں انسانی آبادی کے غلیظ اور فضلہ کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے سارے اسلامی پریس نے بحمداللہ متفق اللفظ ہو کر اسکو اسی قابل سمجھا۔ لیکن ایک استثناء رہا۔ اور اسی استثناء نے مجبور کر دیا، کہ گندگی کے اس قدردان کو ملت اسلامیہ سے پوری طرح روشناس کر دیا جائے۔ ملک کے طول و عرض میں یہ "شرف" ایک ماہوار رسالہ کے حصہ میں آیا، کہ اس نے ایک ضمیمہ ریویو تقریباً تین صفحہ کا کرکے، تصنیف اور مصنف دونوں کے حق میں ٹھیک مغربی انداز سے پروپیگنڈے کا حق ادا کر دیا! آپ حیرت سے دریافت کریں گے، کہ ایسا گندہ نواز رسالہ ہو کون سکتا ہے؟ کیا نگار؟ جواب میں یہ سن کر، حیرت سے زیادہ آپ کو قلق و تاسف ہوگا، کہ وہ رسالہ نیاز فتحپوری کا نگار نہیں، بلکہ آپ کی قومی، ملی، علمی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترجمان رسالہ جامعہ ہے! انا للہ وانا الیہ راجعون! چو کفر از کعبہ الخ

ریویو نگار "م" صاحب ہیں۔ "م" صاحب اگر دوست پروری کا جذبہ برقرار کیے ہوئے تھا، تو وہ کسی دوسرے پردہ میں اپنی پوری شخصیت کے اعلان کے ساتھ اپنی گندہ نوازی کو ظاہر فرما سکتے تھے، لیکن جامعہ کے آرگن میں معمولی تبصروں کے انداز میں اسکے چھپنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ خود ادارہ جامعہ بھی اس تبصرہ سے اگر تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ضرور متفق ہے! اور پھر "کتاب کے ملنے کا پتہ" بغیر "جامعیت" سے شرمائے، بغیر ملت سے شرمائے، بغیر "اسلامیت" سے شرمائے، بغیر اخلاق، شرافت، شائستگی سے شرمائے، "مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ"! اگر مکتبہ کی تاجرانہ ذہنیت اس پستی پر اتر آئی ہے، تو کیوں نہ کوکشاستر اور راجا بال کی تصانیف کی، اور اشتہاری دوا فروش طبیبوں کی کتابوں اور رنگا بچوں کی بھی ایجنسیاں لے لیجائیں؟ انا للہ ثم انا للہ

خدا گواہ ہے کہ جامعہ کی مخالفت میں جب جب قلم اٹھانا پڑا ہے، تو ہمیشہ دل کو اذیت محسوس ہوئی ہے، لیکن جامعہ کے تمام مخلص اور ہوا خواہ ایمان و دیانت سے بتائیں، کہ آخر ایسے موقع پر کیا خاموشی اختیار کیجائے؟ خانگی خطوط لکھے جاتے ہیں، تو انکا جواب تک نہیں مرحمت ہوتا، پھر بجز اخبار میں لکھنے کے اور چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جامعہ نے سیرۃ محمد لکھوائی۔ مسودہ شروع سے آخر تک شیخ الجامعہ کی نظر سے گزرا۔ انھوں نے مختصر دیباچہ لکھا۔ کتاب چھپ کر تیار ہوئی۔ اسکے بعد یہ خیال پیدا ہوا، کہ بعض مقامات فلاں فلاں صاحبوں کو غالباً گراں گزریں۔ اشاعت روک کر، سطر دو سطر نہیں، ورق کے ورق بدلے گئے، ان اوراق کی نئے سرے سے کتابت ہوئی، طباعت ہوئی۔ اور اس میں ہفتوں لگے۔ یہ سب کچھ معدودے چند افراد کی خاطر گوارا کیا گیا، لیکن مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی جس سے بار بار چندوں کی اپیل ہوتی ہے، اس قابل بھی نہیں کہ اسکے جذبات کی اتنی بھی پروا کیجائے!

جامعہ کے ریویو نگار نے جا بجا کتاب کے معائب کا بھی اظہار کیا ہے اور اسکے بعض حصوں کی مخش نگاری وغیرہ کو تسلیم کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی کتاب کے بعض حصوں کی بھی تعریف کی ہے: اور ڈر
جو گندہ نگار کتاب کے بڑے حصہ کا مصنف ہے، اسکی پوری حوصلہ افزائی کی ہے اور بعض افسانوں سے متعلق اس قسم کے فقرے لکھے ہیں:-

"زبان، افعال، انداز، ہر لحاظ سے یہ تصویر مکمل اور دلکش ہے، اور آخری منظر کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔"

میں دوسروں کو نہیں، خود جامعہ والوں ہی کو حکم بناتا ہوں، اور شیخ الجامعہ اور رسالۂ جامعہ کے دونوں ایڈیٹروں سے سوال کرتا ہوں کہ انگارے ساری کتاب سے صرف دو ہی چار صفحے ایسے بتا دیں، جنکی زبان درست ہو، تصویر صحیح ہو، کوئی ادبی حسن ہو، کوئی اخلاقی دلکشی ہو! اور کہیں سے دس بارہ صفحے بھی ایسے نکال دیں، جن میں حق پر، اخلاق پر، معاشرت پر، شعائر دین پر نہایت ہی مبتذل الفاظ اور بازاری لہجہ میں، حملے نہ ہوں؟ رواداری و تحمل اختلاف عقائد میں ہو سکتا ہے، لیکن بر سر بازار اسکے شہدوں کی زبان میں اور سر اکی بھٹیاریوں کے انداز میں کسی کے مذہب کو، اخلاق کو، بزرگوں کو کوسا جائے، تو اس صبر و رواداری کی تعلیم کس کی ہے؟ کیا شیخ الجامعہ کی؟ کیا رسالۂ جامعہ کے دونوں ایڈیٹروں میں سے کسی کی؟ کیا خود "م صاحب" ریویو نگار کی؟ بد عقیدگی کی تاب لائی جا سکتی ہے، لیکن کھلی ہوئی بد تمیزیوں اور عامیانہ گری ہوئی بد مذاقیوں کی تاب کون لا سکتا ہے۔

ے مضمون پریس میں جانے کے بعد اطلاع ملی کہ کتاب یو پی گورنمنٹ نے ضبط کر لی۔ فالحمد للہ۔

"سچ" لکھنؤ۔ ۱۷ مارچ ۱۹۳۳ء

BRITISH MUSEUM, No. 181.

Department of Oriental Printed Books and MSS

June 21st. 1933.

RECEIVED for the Trustees of the BRITISH MUSEUM under the provisions of Act X of 1890 (Government of India)

Superintendent of Records, India Office.

Letter No. R.910/1933.

Proscribed Publications. United Provinces.

1933 1st Quarter.

No. 3. Paigrām Janāb Maulānā Qādri Muhammad Ishāq Sahib.

4. Sankh-Nād. January 2nd,1933.

5. " " " 9th, "

6. " " " 23rd, "

8. " " February 20th,1933.

9. " " March 6th, 1933.

11. Mantrapati Srī Rājendra Prasād kā Vaktavya.

12. Bundelkhand Kesarī. No.22, December 16th,1932.

13. Iman dī Valarā kā Jīvan Charitra.

14. Dī Valarā.

16. Prāntīya Congress Committee kā Kisānon ko Ādesa Lagān ek paisā na do.

17. Angāre.[1]

18. Samar Yātrā aur Anya Kahāniyān.[2]

19. Congress Bulletin. March,12th,1933.

20. Provincial Congress bulletin. January 15th,1933.

21. Bulletin issued by the All India Congress Committee. No.1. January 19th,1933.

F. E. Hammond

India Office Records
L/R/7/75

۱؎ "انگارے"

۲؎ "سمر یاترا" پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ جو "انگارے" سے قبل ضبط ہوا تھا

LIST OF PUBLICATIONS PROSCRIBED BY THE GOVERNMENT OF THE UNITED PROVINCES, UNDER SECTION 99A, CODE OF CRIMINAL PROCEDURE DURING THE QUARTER ENDING MARCH 31, 1933:-

1. A poster in Urdu entitled 'Paigham Janab Maulana Qari Mohammad Ishaq Sahib, Dictator Panjam Jamiat-ul-Ulema, zila Saharanpur.
2. Issues nos. 126 and 127, dated respectively November 28 and December 5, 1932, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
3. Issue no. 128, dated December 12, 1932, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'
4. Issue no. 130, dated January 2, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
5. Issue no. 131, dated January 9, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
6. Issue no. 133, dated January 23, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
7. Issue no. 136, dated February 13, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
8. Issue no. 137, dated February 20, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
9. Issue no. 138, dated March 6, 1933, of the news-sheet in Hindi entitled 'Shankh Nad'.
10. A leaflet in Hindi entitled 'Khun chusnewale hatyare Viceroy ka bahishkar kijiye'.
11. A leaflet in Hindi entitled 'Rashtrapati Sri Rajendra Prasad ka Vaktavya'.

12. Issue no.53, dated November 18, 1932, of the cyclostyled magazine in Hindi entitled 'Bundelkhand Kesari'.
13. A book in Hindi entitled 'Emon De Valera ka Jivan Charitra'.
14. A book in Hindi entitled ' De Valera'.

-2-

15. A leaflet in Hindi headed 'Congress bulletin', dated February 9, 1933.
16. A leaflet in Hindi headed 'Prantiya Congress Committee ka kisanon ko Lagan ka ek paisa na do'.
17. A book in Urdu entitled 'Angare'.
18. A book in Hindi entitled 'Samar Yatra aur anya kahaniyan'.
19. Issue no.426, dated March 12, 1933, of the leaflet in Hindi entitled 'Congress bulletin'.
20. Provincial Congress Bulletin in Hindi no.25-26, dated January 15, 1933, published by the Hind Congress Committee.
21. A pamphlet in English entitled 'Bulletin issued by the All India Congress Committee', no.1, dated January 15, 1933.

ڈپٹی سکریٹری ایچ جے پریمشن کے خط کے ساتھ ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست

No. 316-3/VIII-1212

From

H. J. Frampton, Esq., M.C., I.C.S., M.L.C.,
Deputy Secretary to Government,
United Provinces.

To

The Under Secretary of State for India,
India Office, Whitehall, London, S.W.1.,
England.

Dated Naini Tal, May 11, 1933

Sir,

Police. } In continuation of my letter no. 316/VIII-1212, dated February 11, 1933, I am directed to say that, in exercise of the power conferred by section 99 A of the Code of Criminal Procedure, 1898 (Act V of 1898), the Governor in Council proscribed the publications noted in the attached list during the quarter ending March 31, 1933. I am to forward two copies each of the publications nos. 1.4,6. 8-9. 11-14 and 16-21 and one copy each of nos. 3 and 15. No more copies of nos. 3 and 15 are available nor is any of nos. 2, 7 and 10.

2. I am also to state that copies of publication no. 19 referred to in the penultimate sentence of para 1 of my letter of February 11, 1933 are not available.

I have the honour to be,
Sir,
Your most obedient servant,
H. J. Frampton
Deputy Secretary.

Enclosure :
List of publications
Copies of publications

صوبہ متحدہ اودھ (حالیہ اتر پردیش) کے گورنر کے ڈپٹی سکریٹری
ایچ۔ جے پریمٹن کا خط انڈر سکریٹری برائے امور ہند کے نام ۱۱ رمئی ۱۹۳۳ء

IN DEFENCE OF "ANGAREY"

Shall We Submit To Gagging?

DELHI, Tuesday.

Mr. Mahmuduzzafar, B. A. (Oxon) writes:

Some five months back four young authors, among them a young woman, brought out a collection of short stories in Urdu, under the title "Angarey". I happened to be one of the contributors to this collection. This book at once raised a storm in Moslem circles. It was said to be a shameless attack on Islam and everything decent in Society. The book has already been proscribed by the U. P. Government under Section 295A of the I.P.C. It is even said that funds are being collected to start the prosecution of the authors. Shall we submit to such gagging? That is the question I wish to raise here.

Coming to the contents of the book itself, the stories of my friend S. Sajjad Zaheer are concerned chiefly with the criticism and a satire of the current Moslem conceptions, life and practices. His attack is directed primarily against the intolerable theological burden that is imposed from childhood upon the average Moslem in this country—a burden that leads to a contortion and a cramping, of the inquisitive or speculative mind and the vital vigours body of

both man and woman. Ahmed Ali essays into the realms of poverty, material, spiritual and physical, especially the poverty of the Moslem woman, and with imagination and admirable boldness breaks through the veils of convention to expose the stark reality. Rashid Jehan, who is also a Doctor of Medicine drawing on her practical experience, also portrays vividly the ghastly plight of the woman behind the purdah. My own single contribution, is an attack on the vanity of man which seeks to find an outlet at the expense of the weak and defenceless womanhood. Nobody can deny the truthfulness of those portraits, and any one who chooses to exert himself can see that they are not drawn for the sake of literary 'flaira', but spring from an inner indignation against 'this sorry scheme of things.'

The authors of this book do not wish to make any apology for it. They leave it to float or sink of itself. They are not afraid of the consequences of having launched it. They only wish to defend 'the right of launching it and all other vessels like it'—they stand for the right of free criticism and free expression in all matters of the highest importance to the human race in general and the Indian people in particular. They have chosen the particular field of Islam, not because they bear it any 'special' malice, but because, being born into that particular Society, they felt themselves better qualified to speak for that alone. They were more sure of their ground there. Whatever happens to the book or to the authors, we hope that others will not be discouraged. Our practical proposal is the formation immediately of a League of Progressive authors, which should bring forth similar collections from time to time, both in English and the various vernaculars of our country. We appeal to all those who are interested in this idea to get into touch with us. The may communicate to S. Ahmed Ali, M. A., Jalal Manzil, Kucha Pandit, Delhi.

The Leader (Allahabad)
5 April 1933

روزنامہ لیڈر (انگریزی)۔ الہ آباد ۵ اپریل ۱۹۳۳ء

Deliberate and malicious acts intended to outrage religious feelings of any class by insulting its religion or religious beliefs.

[1]"295A. Whoever, with deliberate and malicious intention of outraging the religious feelings of any class of His Majesty's subjects, by words, either spoken or written, or by visible representations insults or attempts to insult the religion or the religious beliefs of that class, shall be punished with imprisonment of either description for a term which may extend to two years, or with fine, or with both.]

Act XLV 1860
Section 295 A of the Indian Panel Code
V/8/349

(۳) ب

POLICE DEPARTMENT

MISCELLANEOUS
15*th March*, 1933

No. 98/VIII--1031.—In exercise of the power conferred by section 99A of the Code of Criminal Procedure, 1898 (Act V of 1898), the Governor in Council hereby declares to be forfeited to His Majesty every copy of a book in Urdu entitled "Angare", written by Sayed Sajjad Zahir, Ahmad Ali, Rashid Jahan and Mahmudal Zafar, published by Sayed Sajjad Zahir, Batlerganj Lucknow, and printed by Mirza Mohammad Jawad at the Nizami Press, Victoria Street, Lucknow on the ground that the said book contains matter the publication of which is punishable under section 295A of the Indian Penal Code.

United Provinces Gazette. 1933
India Office Records. V/11/1511

صوبہ متحدہ گزٹ۔ لکھنؤ، ۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء

URDU PAMPHLET DENOUNCED

Shias Gravely Upset

(From Our Correspondent)
LUCKNOW, Feb. 21

The following resolution has been passed by the Central Standing Committee of the All-India Shia Conference at a meeting held on Sunday last:—

The Central Standing Committee of the All-India Shia Conference at this meeting strongly condemns the heart-rending and filthy pamphlet called "Angare" compiled by Sajjad Zahir, Ahmad Ali, Rashid Jehan, and Mahmudul Zafar which has wounded the feelings of the entire Muslim Community by ridiculing God and His Prophets and which is extremely objectionable from the stand points both of religion and morality. The Committee further strongly urges upon the attention of the U. P. Government that the book be at once proscribed.

The Hindustan Times
23 February 1933

۲۳ر فروری ۱۹۳۳ء، دی ہندستان ٹائمز، نئی دہلی

نیند نہیں آتی

سجّاد ظہیر

گھڑگھڑ گھڑگھڑ، ٹخ، ٹخ، چٹ، ٹخ ٹخ ٹخ، چٹ چٹ چٹ۔

گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے۔ ے...... ے...... خاموشی اور تاریکی۔ تاریکی، تاریکی۔ آنکھ ایک پل کے بعد کھلی، تکیہ کے غلاف کی سفیدی تاریکی، مگر بالکل تاریکی نہیں....... پھر آنکھ بند ہو گئی۔ مگر پوری تاریکی نہیں۔ آنکھ دبا کر بند کی، پھر بھی روشنی آ ہی جاتی ہے۔ پوری تاریکی کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟

بڑا میرا دوست بنتا ہے، جب ملاقات ہوئی، آیئے اکبر بھائی، آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ ہیں ہیں ہیں۔ کچھ تازہ کلام سنایئے...... لیجیے سگریٹ نوش فرمایئے، مگر سمجھتا ہے، شعر خوب سمجھتا ہے۔ وہ دوسرا اُلّو کا پٹھا تو بالکل خر دماغ ہے۔ اخّاہ! آج تو آپ نئی اچکن پہنے ہیں۔ نئی اچکن پہنے ہیں...... تیرے باپ کا کیا بگڑتا ہے۔ جو مَیں نئی اچکن پہنے ہوں۔ تو چاہتا ہے کہ بس ایک تیرے ہی پاس نئی اچکن ہو۔ اور شعر سمجھنا تو درکنار صحیح پڑھ بھی نہیں سکتا۔ ناک میں دم کر دیتا ہے۔ بیہودہ، بدتمیز کہیں کا! مگر بڑا بھائی میرا دوست بنتا ہے۔ ایسوں کی دوستی کیا! میری باتوں سے اس کا دل ذرا بہل جاتا ہے، بس، یہی دوستی ہے۔ مفت کا مصاحب ملا، چلو مزے ہیں....... خدا سب کچھ کرے، غریب نہ کرے، دوسروں کی

خوشامد کرتے کرتے زبان گھس جاتی ہے، اور وہ ہیں کہ چار پیسے جو جیب میں ہم سے زیادہ ہیں تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ مَیں نے آخر ایک دن کہہ دیا کہ میں نوکر ہوں، کوئی آپ کا غلام نہیں ہوں، تو کیا آنکھیں نکال کر لگا مجھے دیکھنے۔ بس جی میں آیا کہ کان پکڑ کے ایک چانٹا رسید کروں، سالے کا مزاج درست ہو جائے۔

ٹَپ ٹَپ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ، ٹپ ٹپ ٹپ ٹ.......

اس وقت رات کو یہ آخر کون جا رہا ہے؟ مرن ہے اس کی، اور کہیں پانی برسنے لگے تو اور مزہ ہے۔ لکھنؤ میں جب میں تھا، ایک جلسے میں موسلادھار بارش۔ امین الدولہ پارک تالاب معلوم ہوتا تھا۔ مگر لوگ ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اور کیا ہے کیا۔ جو یوں سب جان پر جھیلنے کو تیار ہیں۔ مہاتما گاندھی کے آنے کا انتظار ہے۔ اب آئیں، تب آئیں، وہ آئے، آئے، آئے۔ وہ مچان پر مہاتما جی پہنچے.......جے، جے، جے، خاموشی۔

مَیں آپ لوگوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بدیشی کا پڑا پہننا بالکل چھوڑ دیں۔ یہ سیطانی گورَن منٹ.......

یہاں پانی سر سے ہو کر پیروں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔ قدرت موت رہی تھی سیطانی گورنمنٹ، شیطانی، گورنمنٹ کی نانی۔ اس گاندھی سے شیطانی گورنمنٹ کی نانی مرتی ہے۔ اہاہا، شیطانی اور نانی.......

اکبر صاحب، آپ تو ماشاء اللہ شاعر ہیں، کوئی قومی نظم تصنیف فرمائیے، یہ گل و بلبل کے افسانے کب تک۔ قوم کی ایسی تیسی! میرے ساتھ قوم نے کیا اچھا سلوک کیا ہے کہ میں گل و بلبل چھوڑ کر قوم کے آگے بِھتر کوں۔

مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے آخر کسی کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے کہ

سارا زمانہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرے کپڑے میلے ہیں....... ان سے بدبو آتی ہے....... بدبو سہی۔ میری ٹوپی دیکھ کر کہنے لگا کہ تیل کا دھبہ پڑ گیا، نئی ٹوپی کیوں نہیں خریدتے؟ کیوں خریدوں نئی ٹوپی، نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے؟

انگشت نما تھی کج کلاہی جن کی وہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں آج

ہم اوجِ طالع لعل و گہر کو..... .....

واہ وا واہ! کیا بے تکا پن ہے۔ چارج پنجم کے تاج میں ہمارا ہندستانی ہیرا ہے۔ لے گئے چرا کے انگریز، رہ گئے نا منہ دیکھتے! اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئی دُم ہاتھ میں۔ اب چاہتے کہ دم بھی ہاتھ سے نکل جائے، دُم نہ چھوٹنے پائے۔ شاباش ہے میرے پہلوان! لگائے جا زور! دُم چھوٹی تو عزت گئی۔ کیا کہا؟ عزت؟ عزت لے کے چاٹنا ہے۔ روٹی اور نمک کھا کر کیا بانکا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو پھر کیا کہنا، اور اچھا ہے۔ پھر تو بس عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک۔

خداوند پاک، اللہ، باری تعالیٰ، رب العزت، پرمیشر، پرماتما، لاکھ نام لے جاؤ۔ جلدی، جلدی، جلدی اور جلدی۔ کیا ہوا؟ روحانی سکون؟ بس تمہارے لیے یہی کافی ہے۔ مگر میرے پیٹ میں تو دوزخ ہے۔ دعا کرنے سے پیٹ نہیں بھرتا، پیٹ سے ہوا نکل جاتی ہے بھوک اور زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

بھوں، بھوں، بھوں.......

اب ان کا بھونکنا شروع ہوا تو رات بھر جاری رہے گا۔ مچھر الگ ستا رہے ہیں۔ توبہ ہے توبہ! ایک جالی کا پردہ گرمیوں میں بہت آرام دیتا ہے۔ مچھروں سے نجات ملتی ہے۔ مگر کیا، نجات کیا! دن بھر کی مشقت، چیخ پکار، کڑی دھوپ میں گھنٹوں ایک جگہ سے دوسری جگہ

گھومتے گھومتے جان نکل جاتی ہے۔ اماں کہا کرتی تھیں: اکبر دھوپ میں مت دوڑو، آ، میرے پاس آکے لیٹ بچے! لُو لگ جائے گی تجھے بچے۔
ایک مدّت ہو گئی اسے بھی۔ اب تو یہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ اور مولوی صاحب ہمیشہ میری تعریف کرتے تھے: دیکھو نالائقو، اکبر کو دیکھو اسے شوق ہے علم کا۔ خواب، وہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں میں بستہ تختی لیے دوڑتا ہوا واپس آتا تھا۔ اماں گود سے چمٹا لیتی تھیں مگر کیا آرام تھا! اُس وقت بھی کیا آرام تھا! یہ سب چیزیں میری قسمت میں ہی نہیں۔ مگر جو مصیبت میں برداشت کر چکا شاید ہی کسی کو اٹھانی پڑی ہوں۔ اسے یاد کرنے سے فائدہ؟ خیراتی اسپتال، نرسیں، ڈاکٹر، سب ناک بھوں چڑھائے اور اماں کا یہ حال کہ کروٹ لینا محال۔ اور اُن کے اُگالدان میں خون کے ڈلے کے ڈلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گوشت کے لوتھڑے ہیں .... اور میں سب کو خط پہ خط لکھتا تھا۔ یہی سب جو رشتہ دار بنتے ہیں! آیئے اکبر بھائی آیئے! آپ سے تو برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی... ...یہی! انھیں کے ماں، باپ۔ کیا ہو جاتا اگر ذرا اور مدد کر دیتے۔ دنیا بھر کی خرافات پر پانی کی طرح دولت بہاتے ہیں۔ کسی رشتہ دار کی مدد کرتے وقت ٹل ٹل کر پیسہ دیتے ہیں۔ اور پھر احسان جتانا اتنا کہ خدا کی پناہ! ایک دن میں کہیں باہر گیا ہوا تھا، انھیں صاحبزادے کی والدہ، امّاں کو دیکھنے آئیں۔ میں جب پہنچا تو انھیں آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے، چہرے سے ٹپک رہا تھا کہ انھیں ڈر ہے جراثیم ان کے سینے کے اندر نہ گھس جائیں۔ مگر بیمار کو دیکھنے آنا فرض ہے! ثواب کا کام ہے! یہ سب تو سب اُلٹے مجھے ڈانٹنا شروع کیا: کہاں گئے تھے تم اپنی والدہ کو چھوڑ کر۔ ان کی حالت ایسی نہیں کہ انھیں اس طرح سے چھوڑا جائے... .....مریض کے منہ پر اس کی باتیں! میں غصہ سے کھولنے لگا، مگر مرتا کیا

نہ کرتا۔ اسپتال کا خرچ انھیں لوگوں سے لینا تھا! میرے بیوی بچے کا ٹھکانا انھیں کے یہاں تھا...... میری شادی کی جس نے سنا مخالفت کی۔ لیکن اماں بے چاری کا سب سے بڑا ارمان میری شادی تھی: اکبر کی دلہن بیاہ کے لاؤں، بس میری یہ آخری تمنّا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ گھر میں کھانے کو نہیں شادی کس بوتے پر کروگی۔ اماں کہتی تھیں کہ خدا رازق ہے۔ جب میری نسبت طے ہوگئی، شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی، شادی کا دن آگیا، تو وہی لوگ جو مخالفت کرتے تھے سب برات میں جانے کو تیار ہوکر آگئے۔ ساری بچی بچائی پونجی اماں کی مہمانداری اور شادی کے لوازمات میں خرچ ہوگئی۔ گیس کی روشنی، ریشمی اچکنیں، پلاؤ، باجہ، مسند، ہنسی مذاق، بھیڑ، کھانے میں کمی پڑگئی، باورچی نے چوری کی۔ بادشاہ علی صاحب کا جوتا چوری گیا، زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ابے الّو کے پٹھّے تو نے جوتا سنبھال کے کیوں نہیں رکھا۔ جی حضور! قصور میرا نہیں.........
مہر کا جھگڑا ہونا شروع ہوا۔ موجّل اور معجّل کی بحث، منھ دکھائی کی رسم، سلام کرائی کی رسم، مذاق، پھول، گالی گلوج، شادی ہوگئی۔ امّاں کا ارمان پورا ہوگیا....... محترم علی بچارہ چالیس برس کا ہوگیا اس کی شادی نہیں ہوئی۔ اکبر میاں شادی کروا دیجیے، شیطان رات کو بہت ستاتا ہے۔ شادی، خوشی، کوئی ہمدرد بات کرنے والا جس سے اپنے دل کی ساری باتیں اکیلے سنا دیں۔ کوئی عورت جس سے محبت کرسکیں، دو گھڑی ہنسیں بولیں، چھاتی سے لگائیں، پیار کریں.......ارے مان بھی جاؤ میری جان! میری پیاری، میری سب کچھ، زبان بیکار ہے۔ ہاتھ پیر، سارا جسم، جسم کا ایک ایک رونگٹا.......کیوں آج مجھ سے خفا ہو؟ لو ارے تم نے تو رونا شروع کیا۔ خدا کے واسطے بتاؤ آخر کیا بات کیا ہے؟ دیکھو میری طرف دیکھو تو سہی، وہ آئی ہنسی، وہ آئی ہونٹوں پر۔ بس اب ہنس

تو دو۔ کیا دو دن کی زندگی میں خواہ مخواہ کا رونا دھونا۔ اُفوہ، یوں نہیں یوں اور اور اور زور سے میرے سینے سے لپٹ جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکھنؤ کے کوٹھوں کی سَیر میں نے بھی کی ہے۔ ایسا غریب نہیں ہوں کہ دور ہی دور سے رنڈیوں کو دیکھ کر سسکیاں لیا کروں۔ آیئے حضور اکبر صاحب! یہ کیا ہے۔ جو مدّتوں سے ہماری طرف رُخ ہی نہیں کرتے۔ اِدھر کوئی نئی چلتی ہوئی غزل کہی ہو تو عنایت فرمایئے، گا کر سناؤں، لیجیے پان نوش فرمایئے۔ اے لو اور لو، ذرا دم تو لیجیے نہیں آج تو معاف فرمایئے، پھر کبھی۔ میں تو آپ کی خادم ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روپئے کی غلام۔۔ سمجھتی ہے میرے پاس ٹکے نہیں۔ روپئے دیکھ کر راضی ہو گئی۔ کیا سناؤں حضور؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طبلہ کی تھاپ، سارنگی کی آواز، گانا بجانا۔ پھر تو میں تھا اور وہ تھی اور ساری رات تھی۔ نیند جسے آئی ہو وہ کافر۔ یہ راتوں کا جاگنا، دوسرے دن دردِ سر، تھکاوٹ، بدمزگی۔ اماں کی بیماری کے زمانے میں ان کی پلنگ کی پٹی سے لگا گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ان کی کھانسی کبھی کبھی تو مجھے خود ڈر معلوم ہونے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر کھانسی کے ساتھ ماں کے سینے میں ایک گہرا زخم اور پڑ گیا، ہر سانس کے ساتھ جیسے زخموں پر سے کسی نے تیز چھری کی باڑھ چلا دی، اور وہ گھرگھراہٹ جیسے کسی پُرانے کھنڈر میں لُو چلنے کی آواز ہوتی ہے۔ ہولناک۔ مجھے اپنی ماں سے ڈر معلوم ہونے لگتا۔ اس ہڈی چمڑے کے ڈھانچے میں میری ماں کہاں! میں ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا، دھیرے سے دباتا، ان کی آدھی کھُلی آدھی بند آنکھیں میری طرف مڑتیں، ان کی نظر مجھ پر ہوتی۔ اُس وقت اس شکستہ، پامال، مردہ جسم بھر میں بس آنکھیں زندہ ہوتیں۔ ان کے ہونٹھ ہلتے۔ امّاں، امّاں! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، جی! میں اپنا کان ان کے لبوں کے پاس لے جاتا۔ وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر میرے سر پر رکھتیں۔ میرے بالوں میں ان کی انگلیاں معلوم ہوتا تھا پھنسی جاتی ہیں اور وہ چھڑانا نہیں چاہتیں: بہت دیر ہو گئی، جاؤ تم سو

رہو۔۔۔۔۔۔ اماں یونہی پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ، ایک سال، دو سال، سو سال، ہزار سال۔ موت کا فرشتہ آیا۔ بدتمیز، بیہودہ کہیں کا! چل نکل یہاں سے، بھاگ، ابھی بھاگ، ورنہ تیری دم کاٹ لوں گا، ڈانٹ پڑے گی پھر بڑے میاں کی! ہنستا ہے؟ کیوں کھڑا ہے سامنے دانت نکالے، تیرے فرشتے کی ایسی تیسی۔ تیرے۔۔۔۔۔۔ فرشتے۔۔۔۔۔۔ کی۔

ساری دنیا کی ایسی تیسی، میاں اکبر تمہاری ایسی تیسی۔ ذرا آپ کی قطع ملاحظہ فرمایئے۔ پھونک دو تو اُڑ جائیں۔ بڑے شاعرِ عزّا بنے ہیں۔ مشاعروں میں تعریف کیا ہو جاتی ہے کہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا سمجھتے ہیں بیچارے، سمجھیں گے کیا! بیوی جان کچھ سمجھنے بھی دیں۔ صبح سے شام تک شکایت، رونا دھونا، کپڑا پھٹا ہے، بچے کی ٹوپی کھو گئی، نئی خرید کے لے آؤ۔۔۔۔۔۔ جیسے میری اپنی ٹوپی نئی ہے۔۔۔۔۔۔ کہاں کھو گئی ٹوپی؟ میں کیا جانوں کہاں کھو گئی۔ اس کے ساتھ کونے کونے میں تھوڑی بھاگتی پھرتی ہوں، مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ برتن دھونا، کپڑے سینا، سارے گھر کا کام میرے ذمے ہے، مجھے کسی کی طرح شعر کہنے کی فرصت نہیں، سن لو خوب اچھی طرح سے، مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ بھڑ کا چھتہ چھیڑ دیا اب جان بچانی مشکل ہوئی۔ کیا قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔۔۔۔ ماشاءاللہ، چشم بددور۔۔۔۔۔۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس پہننے کو ایک ٹھکانے کا کپڑا نہیں ہے، لڑکا تمہارا الگ ننگا گھومتا ہے، مگر تم ہو کہ معلوم ہوتا ہے کوئی واسطہ ہی نہیں، جیسے کسی غیر کے بیوی بچے ہیں۔ ہائے اللہ میری قسمت پھوٹ گئی۔۔۔۔۔۔ اب رونا شروع ہونے والا ہے۔ میاں اکبر بہتر یہی ہے کہ تم چپکے سے کھسک جاؤ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے، تمہاری مردانگی میں کوئی فرق نہیں آتا، خیریت بس اب اسی میں ہے کہ خاموشی کے ساتھ کھسک جاؤ۔۔۔۔۔ کرنے سے ایک۔۔۔۔۔ کی جان بچی۔ معلوم نہیں ایسے موقع پر ۔۔۔۔ بیچارے کیا کرتے تھے، عورتوں نے ان کے بھی تو ناک میں دم کر رکھا تھا تو

پھر میری کیا ہستی ہے۔ اے خدا آخر تو نے عورت کیوں پیدا کی ؟ مجھ جیسا غریب کمزور آدمی تیری اس امانت کا بار اپنے کندھوں پر نہیں اٹھا سکتا اور قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ یہی عورتیں وہاں بھی چیخ پکار مچائیں گی، وہ غمزے کریں گی، وہ آنکھیں ماریں گی کہ ۔۔۔ میاں بیچارے خود اپنی سفید داڑھی کھجانے لگیں، قیامت کا دن آخر کیسا ہوگا ؟ سوا نیزے پر آفتاب، مئی جون کی گرمی اس کے سامنے ہیچ ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گرمی کی تکلیف، توبہ توبہ، ارے توبہ! یہ مچھروں کے مارے ناک میں دم، نیند حرام ہوگئی۔ پن پن، چٹ، وہ مارا۔ آخر یہ کمبخت ٹھیک کان کے پاس آکے کیوں بھنبھناتے ہیں۔ خدا کرے قیامت کے دن مچھر نہ ہوں۔ مگر کیا ٹھیک، کچھ ٹھیک نہیں۔ آخر مچھر اور کھٹمل اس دنیا ہی میں خدا نے کس مصلحت سے پیدا کیے ؟ معلوم نہیں پیمبروں کو کھٹمل اور مچھر کاٹتے ہیں یا نہیں۔ کچھ ٹھیک نہیں، کچھ ٹھیک نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا نام کیا ہے ؟ میرا کیا نام ہے، کچھ ٹھیک نہیں۔ واہ واہ ! مصلحتِ خداوندی، خداوندی اور رنڈی اور بھنڈی۔ غلط ! بھن ڈی ہے۔ بھنڈی تھوڑی ہے۔ میاں اکبر! اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے۔ اور کیا ہے ؟ بحرِ ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے، بحرِ رمل چلے، خوب ! وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔ انگور کھٹے ! آپ کو کھٹاس پسند ہے ؟ پسند، پسند سے کیا ہوتا ہے ؟ چیز ہاتھ بھی تو لگے۔ مجھے گھوڑا گاڑی پسند ہے مگر قریب پہنچا نہیں کہ وہ دولتی پڑتی ہے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اور مجھے کیا پسند ہے ؟ میری جان ! اگر تم تو میری جان سے زیادہ عزیز ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلو ہٹو ! بس رہنے بھی دو، تمہاری میٹھی میٹھی باتوں کا مزہ میں خوب چکھ چکی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں کیا ہوا کیا ؟

ہوا کیا ؟ مجھ سے یہ بے غیرتی نہیں سہی جاتی۔ تم جانتے ہو کہ دن بھر لونڈی کی طرح سے میں کام کرتی ہوں، بلکہ لونڈی سے بھی بدتر ! جب سے میں

اِس گھر میں آئی ہوں کسی خدمت گار ن کو ایک مہینہ سے زیادہ ٹکتے نہ دیکھا مجھے سال بھر سے زیادہ ہوگئے اور کبھی جو ذرا دم لینے کی فرصت ملی ہو۔ اکبر کی دلہن یہ کرو، اکبر کی دلہن وہ کرو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ارے کیا ہوا کیا، تم نے پھر رونا شروع کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے کہیں اور لے جاکے رکھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں شریف زادی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب کچھ تو سہہ لیا اب مجھ سے گالی نہ برداشت ہوگی۔ گالی گالی! معلوم نہیں کیا گالی دی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں۔ یا اللہ یا اللہ! اس بیگم کمبخت کا گلا اور میرا ہاتھ۔ اس کی آنکھیں نکل پڑیں، زبان باہر لٹکنے لگی۔ خس کم جہاں پاک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو! قصور ہوا معاف کرو، اکبر! میں نے تمہارے ساتھ احسان بھی کیے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احسان تو ضرور کیے ہیں۔ احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر اب تمہارا وقت آگیا۔ کیا سمجھ کے میری بیوی کو گالیاں دی تھیں؟ بس ختم! آخری دعا مانگ لو! گلا گھوٹنے سے سر کاٹنا بہتر ہے۔ بالوں کو پکڑ کر کٹا ہوا سر اٹھانا، زبان ایک طرف کو نکلی پڑ رہی ہے۔ خون ٹپک رہا ہے، آنکھیں گھور رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا اللہ آخر مجھے کیا ہوگیا؟ خون کا سمندر! مَیں خون کے سمندر میں ڈوبا جارہا ہوں۔ چاروں طرف سے لال لال گولے میری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ آیا! وہ آیا! ایک، دو، تین! سب میرے سر پر آکر پھٹیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہیں یہ دوزخ تو نہیں؟ مگر یہ تو گولے ہیں، آگ کے شعلے نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، میرے رونگٹے جل رہے ہیں۔ دوڑو! ارے دوڑو! خدا کے لیے دوڑو! میری مدد کرو، میں جلا جارہا ہوں میرے سر کے بال جلنے لگے۔ پانی! پانی! کوئی سنتا کیوں نہیں؟ خدا کے واسطے میرے سر پر پانی ڈالو! کیا؟ اِن جلتے ہوئے انگاروں پر سے مجھے ننگے پیر چلنا پڑے گا؟ کیا؟ میری آنکھوں میں دہکتے ہوئے لوہے کی سلاخیں

ڈالی جائیں گی ؟ کیا ؟ مجھے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا ؟ کیا کیا کیا؟ مجھے پیپ کھانا پڑے گی ؟ یہ شعلے میری طرف کیوں بڑھتے چلے آرہے ہیں ؟ یہ شعلے ہیں یا نیزے ہیں ؟ آگ کے نیزے ! زخم کی بھی تکلیف اور جلنے کی بھی۔ یہ کس کے پیخنے کی آواز آئی ؟ میں تو سن چکا ہوں اس آواز کو۔ اُو اُو اُو...... او و و و...... آواز دور ہوتی جاتی ہے۔ میرے لڑکے نے آخر کیا قصور کیا ہے ؟ میرے لڑکے کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے ؟ میرا لڑکا تو ابھی چار برس کا ہے۔ اسے تو معاف کر دینا چاہیئے۔ میں گنہگار ہوں ! میں خطاوار ہوں ! یہ کون آرہا ہے میرے سامنے سے ؟ ارے معاذاللہ ! سانپ چمٹے ہوئے ہیں اس کی گردن سے۔ اس کے پستان کو کاٹ رہے ہیں......

اے حضور ! آداب عرض ہے ! اے حضور بھول گئے ہم غریبوں کو؟ میں ہوں منّی جان ! کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل۔ اے ہے آپ تو جیسے ڈرے جاتے ہیں حضور ! یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ میں جب یہاں داخل ہوئی تو داروغہ صاحب نے کہا، بی منّی جان ! سرکار کا حکم ہے پانچ بچھو تمہاری خدمت کے لیے حاضر کیے جائیں۔ میں حضور سہم گئی۔ بچپن سے مجھے بچھوؤں سے نفرت تھی۔ میں نے حضور بہت ہاتھ پیر جوڑے، مگر داروغہ صاحب نے کہا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل ان پر فرض ہے۔ تب میں نے کہا کہ اچھا آپ مجھے سرکار کے دربار میں پہنچا دیں، میں خود ان سے عرضداشت کروں گی، داروغہ صاحب بیچارے بھلے آدمی تھے، مجھے اپنے پاس بلا کے بٹھایا، میرے گالوں پر ہاتھ پھیرے، آخر کار راضی ہو گئے۔ پہلے تو مجھے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ داروغہ صاحب نے کہا کہ اس وقت سرکار پیمبروں کی کونسل کر رہے ہیں، جب اس سے فرصت ہو گی تب میری پیشی ہو گی۔ میں نے جو یہ سُنا تو کوشش کی کہ جھانک کر اپنے پیمبر صاحب کا جلوہ دیکھ لوں، مگر

دروازے کے دربان، موئے مُسٹنڈے دیو، مجھے دھکا دے کر الگ کر دیا خیر حضور، آخر کار میری باری آئی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ سرکار کے دربار میں داخل ہونے کے ساتھ ہی گھٹنوں کے بَل گر پڑی۔ میری اپنی زبان سے تو کچھ بولا نہ جاتا تھا، داروغہ صاحب نے میرا احوال بیان کیا۔ اتنے میں حکم ہوا کھڑی ہو۔ میں حضور کھڑی ہو گئی۔ تو سرکار خود اُٹھ کے میرے پاس تشریف لائے۔ بڑی سی سفید داڑھی، گورا چِٹّا رنگ، اور میری طرف مسکرا کے دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بغل کے کمرے میں لے گئے۔ میری حضور سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ...... مگر حضور دیکھنے ہی میں بڈّھے معلوم ہوتے ہیں، ایسے مرد دنیا میں تو مَیں نے دیکھے نہیں، اور آپ کی دعا سے حضور میرے یہاں بڑے بڑے رئیس آتے تھے خیر تو حضور بعد میں سرکار نے فرمایا کہ سزا تو تجھے ضرور ملے گی، کیونکہ اُن کا انصاف تو سب کے ساتھ برابر ہے، مگر بجائے بچھو کے مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چاٹا کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے حضور تو اس میں تکلیف کچھ نہیں اور مزا ہی ہے...... مگر آپ تو مجھ سے ڈرے جاتے ہیں۔ اکبر صاحب! اے حضور اکبر صاحب...... کوئی ٹُھمری، کوئی دادرا.....

کوئی غزل.......

یا اللہ مجھے جہنم کی آگ سے بچا! تو ارحم الرّاحمین ہے۔ میں تیرا ایک ناچیز گنہگار بندہ تیرے سامنے دست بہ دعا ہوں...... مگر کچھ بھی ذلّت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں۔ مگر میں کروں تو کیا کروں؟ بھوکا مَروں؟ ہڈّیوں کا ایک ڈھانچہ اُس پر ایک کھوپڑی۔ کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جا رہی ہے۔ اکبر صاحب! آپ کے جسم کا گوشت کیا ہوا؟ آپ کا چمڑا کدھر گیا؟ جی میں بھوکا مر رہا ہوں، گوشت اپنا میں نے گِدھوں کو کھلا دیا، چمڑے کے طبلے بنوا کر بی منی جان کو تحفہ دے دیئے۔ کہیے کیا خوب

سوجھی! آپ کو رشک آتا ہو تو بسم اللہ میری پیروی کیجیے، میں کسی کی پیروی نہیں کرتا! مَیں آزاد ہوں، ہوا کی طرح سے! آزادی کی آج کل اچھی ہوا چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکّر میں ہیں۔ موت یا آزادی! نہ مجھے موت پسند نہ آزادی۔ کوئی میرا پیٹ بھر دے۔

پِن، پن پِن۔ چَٹ، ہت ترے مچھّر کی۔ ...... ٹَن ٹَن ٹَن ..... ٹَن ٹَن ....

جنّت کی بشارت

سجّاد ظہیر

لکھنؤ اس زوال کی حالت میں بھی علوم اسلامیہ کا مرکز ہے۔ متعدد عربی مدارس آج کل کے پُرآشوب زمانے میں شمع ہدایت روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے حرارت ایمانی رکھنے والے قلوب یہاں آکر تحصیل علم دین کرتے ہیں اور اسلام کی عظمت قایم رکھنے میں معین ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ دو فرقے جن کے مدارس لکھنؤ میں ہیں ایک دوسرے کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ مگر اگر ہم اپنی آنکھوں سے اس فرقہ بندی کی عینک اُتار دیں اور ٹھنڈے دل سے ان دونوں گروہ کے اساتذہ اور طلبا پر نظر ڈالیں تو ہم ان سب کے چہروں پر اُس ایمانی نور کی جھلک پائیں گے جس سے اُن کے دل اور دماغ منوّر ہیں۔ اُن کے لمبے کُرتے اور قبائیں، ان کی کفش اور سلیپر، ان کی دو پلّی ٹوپیاں ، اُن کا گُھٹا ہوا گول سر اور ان کی متبرک داڑھیاں جن کے ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی، ان سب سے ان کا تقدس اور زہد ٹپکتا ہے۔ مولوی محمد داؤد صاحب برسوں سے ایک مدرسے میں درس دیتے ہیں اور اپنی ذہانت کے لیے مشہور تھے۔ عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ ماہِ مبارک رمضان میں رات کی رات، تلاوت و نماز خوانی میں گزر جاتی تھی اور انھیں خبر تک نہ ہوتی۔ دوسرے دن جب دورانِ درس میں نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو طالب علم سمجھتے تھے کہ مولانا پر کیف روحانی طاری ہے اور خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہر مسلمان کے لیے رحمت الٰہی ہے۔ علی الخصوص جب رمضان مئی اور جون کے لمبے دن اور تپتی ہوئی دھوپ کے ساتھ پڑے۔ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر زیادہ تکلیف برداشت کرتا ہے اسی قدر زیادہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ ان شدید گرمی کے دنوں میں اللہ کا ہر نیک بندہ مثل ایک بپھرے ہوئے شیر کے ہوتا ہے۔ جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہو۔ اس کا خشک چہرہ اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ: اے وہ گروہ جو ایمان نہیں لاتے اور اے وہ بدنصیبو! جن کے ایمان ڈگمگا رہے ہیں، دیکھو! ہماری صورت دیکھو! اور شرمندہ ہو۔ تمہارے دلوں پر، تمہاری سماعت پر اور تمہاری بصارت پر اللہ پاک نے مہر لگا دی ہے، مگر وہ جن کے دل خوف خدا سے تھرّا رہے ہیں، اس طرح اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔"

یوں تو ماہِ مبارک کا ہر دن اور ہر رات عبادت کے لیے ہے مگر سب سے زیادہ فضیلت شبِ قدر کی ہے۔ اس رات کو بارگاہ خداوندی کے دروازے اجابتِ دعا کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں، گناہ گاروں کی توبہ قبول کرلی جاتی ہے اور مومنین بے حد و حساب ثواب لوٹتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اس شب مسعود کو نماز خوانی اور تلاوتِ قرآن مجید میں بسر کرتے ہیں۔ مولوی داؤد صاحب کبھی ایسے اچھے موقعوں پر کوتاہی نہ کرتے تھے۔ انسان ہر ہر لمحہ اور ساعت میں نہ معلوم کتنے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اچھے بُرے ہزاروں خیال دماغ سے گزرتے ہیں۔ قیامت کے ہولناک دن جب ہر شخص کے گناہ اور ثواب تولے جائیں گے اور رتّی رتّی کا حساب دینا ہوگا تو کیا معلوم کیا نتیجہ ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جتنا زیادہ ثواب ممکن ہو حاصل کرلیا جائے۔ مولوی داؤد صاحب کو جب لوگ منع کرتے تھے کہ اس قدر زیادہ ریاضت نہ کیا کریں تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے۔

مولانا کا سن کوئی پچاس سال کا ہوگا، گو کہ پستہ قد تھے مگر توانا گندمی

رنگ، تکُنی داڑھی، بال کھچڑی تھے۔ مولانا کی شادی اُنیس یا بیس برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ آٹھویں بچے کی وقت ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا دو سال بعد اُنچاس برس کے سن میں مولانا نے دوسرا نکاح کیا۔ مگر ان نئی ممدوحہ کی وجہ سے مولانا کی جان ضیق میں رہتی۔ ان کے اور مولوی داؤد صاحب کے سن میں قریب بیس برس کا فرق تھا۔ گو کہ مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چند بال بلغم کی وجہ سے سفید ہوگئے ہیں لیکن ان کی جوان بیوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کرتیں اور مولانا کو چپ ہو جانا پڑتا۔

ایک سال کے شدید انتظار کے بعد شب قدر پھر آئی۔ افطار کے بعد مولانا گھنٹے آدھ گھنٹے لیٹے، اس کے بعد غسل کرکے مسجد میں نماز و دعا خوانی کے لیے فوراً روانہ ہوگئے۔ مسجد میں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ اللہ کے عقیدت مند اور نیک بندے تہبندیں باندھے، لمبی لمبی ڈکاریں لیتے ہوئے مولانا داود صاحب سے مصافحہ کرنے کے لیے لپکے۔ مولانا کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا اور ان کا عصا گویا اُن کے ایمان کی راستی کا شاہد بن کر سارے مجمع کو مرعوب کر رہا تھا عشا کے بعد ڈیڑھ دو بجے رات تک اکتساب ثواب کا ایک لگاتار سلسلہ رہا، اس کے بعد سحر گہی کی حاضر لذت سے جسم نے نمو پائی اور مولانا گھر واپس چلے۔ جماہی پر جماہی چلی آتی تھی، شیرمال، پلاؤ اور کھیر سے بھرا ہوا معدہ آرام ڈھونڈھ رہا تھا۔ خدا خدا کرکے مولانا گھر واپس پہنچے۔ روح اور جسم کے درمیان سخت جنگ جاری تھی۔ لیلۃ القدر کے دو تین گھنٹے ابھی باقی تھے جو عبادت میں بسر کیے جا سکتے تھے۔ مگر جسم کو بھی سکون اور نیند کی بے انتہا خواہش تھی۔ آخر کار اس پُرانے زاہد نے روحانیت کا دامن تھام لیا اور آنکھیں مل کر نیند بھگانے کی کوشش کی۔

گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا، لالٹین بجھی پڑی تھی۔ مولانا نے دیا سلائی اِدھر اُدھر ٹٹولی مگر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ صحن کے ایک کونے میں ان کی بیوی کا

پلنگ تھا، مولانا دبے قدم، ڈرتے ڈرتے، اُدھر بڑھے اور آہستہ سے بیوی کا شانہ ہلایا۔ گرمیوں کی تاروں بھری رات، اور پچھلے پہر کی خنکی میں مولوی صاحب کی جوان بیوی گہری نیند سو رہی تھیں۔ آخر کار انھوں نے کروٹ بدلی، اور آدھے جاگتے، آدھے سوتے ہوئے دھیمی آواز سے پوچھا "اے کیا ہے؟"

مولانا اس نرم آواز کے سننے کے عادی نہ تھے۔ ہمت کر کے ایک لفظ بولے "دیا سلائی"۔

مولوی صاحب کی بیوی پر ابھی تک نیند غالب تھی مگر اس نیم بیداری کے عالم میں، رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خنکی نے شباب پر اپنا طلسم کر دیا تھا۔ یکبارگی انھوں نے مولانا کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا اور اُن کے گلے میں دونوں باہیں ڈال کر، اپنے گال کو اُن کے منھ پر رکھ کر، لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا "آؤ لیٹو"۔

ایک لمحہ کے لیے مولانا کا بھی دل پھڑک گیا۔ مگر دوسرے لمحے میں انھیں حوا کی آرزو، آدم کا پہلا گناہ، زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی پوری فہرست یاد آگئی اور اپنے پر قابو ہو گیا۔ چاہے یہ سن کا تقاضا ہو، یا خوفِ خدا، یا روحانیت کے سبب سے ہو، بہر حال مولانا فوراً اپنی بیوی کے ہاتھ سے نکل کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور پتلی آواز سے پھر پوچھا "دیا سلائی کہاں ہے؟"

ایک منٹ میں عورت کی نیند اور اس کی بیساختہ خواہش کی اُمنگ، دونوں غائب ہو کر طنز آمیز غصہ سے بدل گئیں۔ مولانا کی بیوی پلنگ پر اُٹھ بیٹھیں اور زہر سے بجھی ہوئی زبان سے، ایک ایک لفظ تول تول کر کہا "بڈھا موا! آٹھ بچوں کا باپ! بڑا نمازی بنا ہے! رات کی نیند حرام کر دی، دیا سلائی، دیا سلائی! طاق پر پڑی ہوگی"۔

ایک مُسن مرد کا دل دکھانے کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ نہیں

کہ اس کی جوان بیوی اسے بڈھا کہے۔ مولانا کانپ گئے مگر کچھ بولے نہیں۔ انھوں نے لالٹین جلاکر ایک تخت پر جا نماز بچھائی اور قرآن خوانی میں مشغول ہوگئے۔ مولانا کی نیند تو اڑ گئی تھی مگر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بھرے ہوئے معدے کے ابخارات نے جسم کو چور کرکے آنکھوں کو دبانا شروع کیا۔ سورۂ رحمٰن کی فصاحت اور مولانا کی دلآویز قرأت نے لوری کا کام کیا۔ تین چار مرتبہ اونگھ کر مولانا جا نماز ہی پر فَبِاَیِّ، اٰ یِّ کہتے کہتے سو گئے۔

پہلے تو ان پر نیند کی گم شدگی طاری رہی، اس کے بعد انھوں نے یکایک محسوس کیا کہ وہ اکیلے، تن تنہا، ایک تاریک میدان میں کھڑے ہوئے ہیں اور خوف سے کانپ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اندھیرا روشنی سے بدلنے لگا اور کسی نے ان کے پہلو سے کہا "سجدہ کر! تو بارگاہ باری تعالیٰ میں ہے"۔ کہنے کی دیر تھی کہ مولوی صاحب سجدے میں گر پڑے اور ایک دل دہلا دینے والی آواز، بادل کی گرج کی طرح، چاروں طرف گونجتی ہوئی مولوی صاحب کے کان تک آئی "میرے بندے ہم تجھ سے خوش ہیں! تو ہماری اطاعت میں تمام زندگی اس قدر محو رہا کہ کبھی تو نے اپنی عقل اور اپنے خیال کو جنبش تک نہ دی جو دونوں شیطانی طاقتیں ہیں اور کفر و الحاد کی جڑ ہیں۔ انسانی سمجھ ایمان و اعتقاد کی دشمن ہے۔ تو اس راز کو خوب سمجھا اور تو نے کبھی نورِ ایمان کو عقل کے زنگ سے تاریک نہ ہونے دیا، تیرا انعام جنت ابدی ہے جس میں تیری خواہش پوری کی جائے گی"۔ آواز یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

تھوڑی مدت تک تو مولوی صاحب پر رعبِ خداوندی اس قدر غالب رہا کہ سجدے سے سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ دیر جب دل کی دھڑکن کم ہوئی تو انھوں نے لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے اپنے داہنے، بائیں نظر ڈالی۔ ان آنکھوں نے کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ سنسان میدان ایک عظیم الشان گول کمرے سے بدل گیا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں جواہرات کی تھیں

جن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سرخ، سبز، زرد، سنہرے اور روپہلے، جگمگاتے ہوئے پھول اور پھل معلوم ہوتا تھا در و دیوار سے ٹپکے پڑتے ہیں۔ روشنی دیواروں سے چھن چھن کر آ رہی تھی، لیکن ایسی روشنی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے! مولانا اٹھ بیٹھے اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔

عجیب! عجیب! ہر چہار طرف کمرے کی دیوار پر کوئی ساٹھ یا ستّر قدِ آدم کھڑکیاں تھیں اور ہر کھڑکی کے سامنے ایک چھوٹا سا دریچہ۔ ہر ایک دریچہ پر ایک حور کھڑی ہوئی تھی۔ مولانا جس طرف نظر پھیرتے حوریں ان کی طرف دیکھ کر مسکراتیں اور دلآویز اشارے کرتیں۔ مگر مولانا جھینپ کر آنکھیں جھکا لیتے۔ دنیا کا مہذب زاہد اس وجہ سے شرمندہ تھا کہ یہ سب کی سب حوریں سر سے پیر تک برہنہ تھیں۔ دفعتہً مولانا نے اپنے جسم پر جو نظر ڈالی تو وہ خود بھی اسی نورانی جامے میں تھے۔ گھبرا کر انھوں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ہنس تو نہیں رہا ہے، مگر سوا ان حوروں کے اور کوئی بھی نظر نہ آیا۔ دنیا کی شرم گو کہ بالکل غائب نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے وجود کی سب سے بڑی وجہ یعنی اغیار کا طنز و تمسخر جنت میں کہیں نام کو بھی نہ تھا۔ مولانا کی گھبراہٹ کم ہوئی۔ ان کی رگوں میں جوانی کا خون ازسرِ نو دوڑ رہا تھا، وہ جوانی — جس کا زوال نہیں!

مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے، حور آگے بڑھی اور انھوں نے اُس پر سر سے پیر تک نظر ڈالی۔ اس کے جسم کا دمکتا ہوا چمپئی رنگ، اس کی کٹیلی آنکھیں، اس کا دل فریب تبسّم، اِس جنتِ نگاہ سے مولانا کی آنکھیں ہٹتی ہی نہ تھیں لیکن انسان ایک اچھی چیز سے بھلا کب سیر ہوتا ہے۔ مولانا کے قدم اُٹھے اور وہ دوسرے در کی طرف بڑھے۔ اسی طرح وہ ہر در پر جا کر تھوڑی دیر رُکتے، ان

بہشتی ہستیوں کے ہر ہر عضوِ بدن کو غور سے دیکھتے اور مسکرا کر درود پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ کسی کے گھونگھر والے بالوں کی سیاہی انھیں سب سے زیادہ پسند آتی، کسی کے گلابی گال، کسی کے عنابی ہونٹ، کسی کی متناسب ٹانگیں، کسی کی پتلی انگلیاں، کسی کی خمار آلود آنکھیں، کسی کی نوکیلی چھاتیاں، کسی کی نازک کمر، کسی کا نرم پیٹ۔

آخر کار ایک حور کی پیاری ادا نے مولانا کا دل موہ لیا۔ وہ فوراً اُچک کے اس کے حجرے میں داخل ہوئے اور اسے بیساختہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر ابھی لب سے لب ملے ہی تھے کہ پیچھے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اس بے موقع ہنسی پر مولانا کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُن کی آنکھ کھل گئی۔ سورج نکل آیا تھا۔ مولانا جانماز پر پیٹ کے بَل پڑے ہوئے ۔۔۔ ۱؎ ۔۔۔ کو سینے سے لگائے تھے۔ ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔

۱؎ کتاب کا نام (خ۔ع)

گرمیوں کی ایک رات

سجّاد ظہیر

منشی برکت علی عشاء کی نماز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد پارک تک چلے آئے۔ گرمیوں کی رات، ہوا بند تھی۔ شربت کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے پاس لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لونڈے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے بیلے کے ہار والے ہر بھلے مانس کے پیچھے ہار لے کر لپکتے۔ چوراہے پر تانگہ اور یکّہ والوں کی لگاتار پکار جاری تھی۔

"چوک! ایک سواری چوک! میاں چوک پہنچادوں!"

"اے حضور کوئی تانگہ وانگہ چاہیئے؟"

"ہار بیلے کے! گجرے موتیئے کے!"

"کیا ملائی کی برف ہے۔"

منشی جی نے ایک ہار خریدا، شربت پیا اور پان کھا کر پارک کے اندر داخل ہوئے۔ بنچوں پر بالکل جگہ نہ تھی۔ لوگ نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند بے سرے گانے کے شوقین اِدھر اُدھر شور مچا رہے تھے، بعض آدمی چپ بیٹھے دھوتیاں کھسکا کر بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں اور رانیں کھجانے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں وہ مچھروں پر بھی جھپٹ جھپٹ کر حملے کرتے جاتے تھے منشی جی چونکہ پائجامہ پوش آدمی تھے انھیں اس بدتمیزی پر بہت غصّہ آیا۔ اپنے جی میں انھوں نے کہا کہ اِن کم بختوں کو کبھی تمیز نہ آئے گی، اتنے میں ایک

بنچ پر سے کسی نے انھیں پکارا۔

"منشی برکت علی!"

منشی جی مڑے۔

"اخاہ لالہ جی آپ ہیں، کہیے مزاج تو اچھے ہیں!"

منشی جی جس دفتر میں نوکر تھے لالہ جی اس کے ہیڈ کلرک تھے منشی جی ان کے ماتحت تھے۔ لالہ جی نے جوتے اُتار دیے تھے اور بنچ کے بیچوں بیچ میں پیر اُٹھا کر اپنا بھاری بھرکم جسم لیے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی توند پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے جاتے اور اپنے ساتھیوں سے جو بنچ کے دونوں کونوں پر ادب سے بیٹھے ہوئے تھے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ منشی جی کو جاتے دیکھ کر انھوں نے انھیں بھی پکار لیا۔ منشی جی لالہ صاحب کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

لالہ جی ہنس کے بولے "کہو منشی برکت علی، یہ ہار وار خریدے ہیں، کیا ارادے کیا ہیں؟" اور یہ کہہ کر زور سے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف داد طلب کرنے کو دیکھا۔ انھوں نے بھی لالہ جی کا منشا دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔

منشی جی بھی روکھی پھیکی ہنسی ہنسے "جی ارادے کیا ہیں ہم تو آپ جانئے غریب آدمی ٹھہرے، گرمی کے مارے دم نہیں لیا جاتا، راتوں کی نیند حرام ہو گئی، یہ ہار لے لیا شاید دو گھڑی آنکھ لگ جائے۔"

لالہ جی نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنسے "شوقین آدمی ہو منشی، کیوں نہ ہو!" اور یہ کہہ کر پھر اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

منشی جی نے موقع غنیمت جان کر کہا "اچھا لالہ جی چلتے ہیں، آداب عرض ہے۔" اور یہ کہہ کر آگے بڑھے۔ دل ہی دل میں کہتے تھے کہ دن بھر کی گھس گھس کے بعد یہ لالہ کمبخت سر پڑا۔ پوچھتا ہے ارادے کیا ہیں! ہم کوئی رئیس تعلقدار ہیں کہیں کے کہ رات کو بیٹھ کر مجرا سنیں اور کوٹھوں کی سیر کریں، جیب میں کبھی چونّی سے زیادہ ہو بھی سہی، بیوی، بچے، ساٹھ روپیہ مہینہ، اوپر سے آدمی

کا کچھ ٹھیک نہیں، آج نہ جانے کیا تھا جو ایک روپیہ مل گیا۔ یہ دیہاتی اہل معاملہ کمبخت روز بروز چالاک ہوتے جاتے ہیں۔ گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد جیب سے ٹکا ٹکالتے ہیں۔ اور پھر سمجھتے ہیں کہ غلام خرید لیا، سیدھے بات نہیں کرتے کمینہ نیچے درجے کے لوگ ان کا سر پھر گیا ہے۔ آفت ہم بیچارے شریف سفید پوشوں کی ہے۔ ایک طرف تو نیچے درجے کے لوگوں کے مزاج نہیں ملتے، دوسری طرف بڑے صاحب اور سرکار کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے کا ذکر ہے، بنارس کے ضلع میں دو محرّر بیچارے رشوت ستانی کے جرم میں برخواست کر دیے گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے غریب بیچارہ پستا ہے بڑے افسر کا بہت ہوا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا۔

" منشی جی صاحب" کسی نے بازو سے پکارا۔ جمّن چپراسی کی آواز۔

منشی جی نے کہا" اخّاہ تم ہو جمّن"۔

مگر منشی جی چلتے رہے رُکے نہیں۔ پارک سے مڑ کر نظیر آباد میں پہنچ گئے جمّن ساتھ ساتھ ہو لیا۔ دُبلے پتلے، پستہ قد، مخمل کی کشتی نما ٹوپی پہنے، ہار ہاتھ میں لیے آگے آگے منشی جی اور ان سے قدم دو قدم پیچھے صافہ باندھے، چپکن پہنے قوی ہیکل، لمبا چوڑا چپراسی جمّن۔

منشی جی نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس وقت جمّن کا میرے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا مقصد کیا ہے۔

" کہو بھئی جمّن، کیا حال ہے۔ ابھی پارک میں ہڈ کلارک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی گرمی کی شکایت کرتے تھے"۔

" اجی منشی جی کیا عرض کروں، ایک گرمی صرف تھوڑی ہے مارے ڈالتی ہے، ساڑھے چار پانچ بجے دفتر سے چھٹی ملی۔ اس کے بعد سیدھے وہاں سے بڑے صاحب کے ہاں گھر پر حاضری دینی پڑی۔ اب جا کر وہاں سے چھٹکارا ہوا تو گھر جا رہا ہوں، آپ جانیے کہ دس بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک دوڑ دھوپ رہتی

ہے، کچہری کے بعد تین دفعہ دوڑ دوڑ کر بازار جانا پڑا۔ برف، ترکاری، پھل سب خرید کے لاؤ اور اوپر سے ڈانٹ الگ پڑتی ہے، آج داموں میں ٹکا زیادہ کیوں ہے اور یہ پھل سڑے کیوں ہیں۔ آج جو آم خرید کے لے گیا تھا وہ بیگم صاحب کو پسند نہیں آئے، واپسی کا حکم ہوا۔ میں نے کہا حضور! اب رات کو بھلا یہ واپس کیسے ہوں گے، تو جواب ملا ہم کچھ نہیں جانتے کوڑا تھوڑی خریدنا ہے۔ سو حضور یہ روپیہ کے آم گلے پڑے، آم والے کے ہاں گیا تو ایک تو تو میں میں کرنی پڑی، روپیہ کے آم بارہ آنے میں واپسی ہوئے چونّی کی چوٹ پڑی مہینہ کا ختم، اور گھر میں حضور قسم لے لیجیے جو سوکھی روٹی بھی کھانے کو ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کونسا منہ لے کر جورو کے سامنے جاؤں"۔

منشی جی گھبرائے آخر جمّن کا منشا اس ساری داستان کے بیان کرنے سے کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ غریب تکلیف اٹھاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں مگر منشی جی کا اس میں کیا قصور؟ ان کی زندگی خود کون بہت آرام سے کٹتی ہے منشی جی کا ہاتھ بے ارادے اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ روپیہ جو آج انھیں اوپر سے ملا تھا صحیح سلامت جیب میں موجود تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو میاں جمّن، آج کل کے زمانے میں غریبوں کی مرن جسے دیکھو یہی رونا روتا ہے، کچھ گھر میں کھانے کو نہیں۔ سچ پوچھو تو سارے آثار بتاتے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ دنیا بھر کے جعلیے تو چین سے مزے اڑاتے ہیں اور جو بیچارے اللہ کے نیک بندے ہیں انھیں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے۔

جمّن چپ چاپ منشی جی کی باتیں سنتا ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ منشی جی یہ سب کہتے تو جاتے تھے مگر ان کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی معلوم نہیں ان کی باتوں کا جمّن پر کیا اثر ہو رہا تھا۔

"کل جمعہ کی نماز کے بعد مولانا صاحب نے آثار قیامت پر وعظ فرمایا

میاں جمّن سچ کہتا ہوں، جس جس نے سنا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بھائی دراصل یہ ہم سب کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے، خدا کی طرف سے جو کچھ عذاب ہم پر نازل ہو وہ کم ہے۔ کونسی برائی ہے جو ہم میں نہیں؟ اس سے کم قصور پر اللہ نے بنی اسرائیل پر جو مصیبتیں نازل کیں ان کا خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر وہ تو تم جانتے ہی ہوگے۔"

جمّن بولا " ہم غریب آدمی منشی جی، بھلا یہ سب علم کی باتیں کیا جانیں قیامت کے بارے میں تو میں نے سنا ہے مگر حضور آخر یہ بنی اسرائیل بیچارے کون تھے۔"

اِس سوال کو سن کر منشی جی کو ذرا سکون ہوا۔ خیر غربت اور فاقے سے گزر کر اب قیامت اور بنی اسرائیل تک گفتگو کا سلسلہ پہنچ گیا تھا۔ منشی جی، خود کافی طور پر اس قبیلے کی تاریخ سے واقف نہ تھے مگر ان مضمونوں پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔

" ایں! واہ میاں جمّن واہ، تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کس چڑیا کا نام ہے۔ میاں سارا کلام پاک بنی اسرائیل کے ذکر سے تو بھرا پڑا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟"

" ارے بھئی حضرت موسیٰ۔ مو...... سا۔"

"موسا...... وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی؟"

منشی جی زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ اب انھیں بالکل اطمینان ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ قیصر باغ کے چوراہے تک بھی آ پہنچے تھے۔ یہاں پر تو ضرور ہی اس بھوکے چپراسی کا ساتھ چھوٹے گا۔ رات کو اطمینان سے جب کوئی کھانا کھا کر نماز پڑھ کر، دم بھر کی دلبستگی کے لیے چہل قدمی کو نکلے، تو ایک غریب بھوکے انسان کا ساتھ ساتھ ہو جانا، جس سے پہلے کی واقفیت بھی ہو، کوئی خوشگوار

بات نہیں۔ مگر منشی جی آخر کرتے کیا؟ جمّن کو کتّے کی طرح دھتکار تو سکتے نہ تھے کیونکہ ایک تو کچہری میں روز کا سامنا، دوسرے وہ نیچے درجے کا آدمی ٹھہرا، کیا ٹھیک، کوئی بدتمیزی کر بیٹھے تو سر بازار خواہ مخواہ کو اپنی بنی بنائی عزّت میں بٹّہ لگے۔ بہتر یہی تھا کہ اب اس چوراہے پر پہنچ کر دوسری راہ لی جائے اور یوں اس سے چھٹکارا ہو۔

"خیر، بنی اسرائیل اور موسیٰ کا ذکر میں تم سے پھر کبھی پوری طرح کروں گا، اس وقت تو ذرا مجھے اِدھر کام سے جانا ہے .... سلام میاں جمّن"۔

یہ کہہ کر منشی جی قیصر باغ کے سینما کی طرف بڑھے۔ منشی جی کو یوں تیز قدم جاتے دیکھ کر پہلے تو جمّن ایک لمحہ کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اس کی آنکھیں ایک بے معنی طور پر اِدھر اُدھر مڑیں۔ تیز بجلی کی روشنی، فوّارہ، سینما کے اشتہار، ہوٹل، دوکانیں، موٹر، تانگے، یکے اور سب کے اوپر تاریک آسمان اور جھلملاتے ہوئے ستارے۔ غرض خدا کی ساری بستی۔

دوسرے لمحہ میں جمّن منشی جی کی طرف لپکا۔ وہ اب کھڑے سینما کے اشتہار دیکھ رہے تھے اور بیحد خوش تھے کہ جمّن سے جان چھوٹی۔

جمّن نے ان کے قریب پہنچ کر کہا "منشی جی!"

منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ساری مذہبی گفتگو، ساری قیامت کی باتیں، سب بیکار گئیں۔ منشی جی نے جمّن کو کچھ جواب نہیں دیا۔

جمّن نے کہا "منشی جی اگر آپ اس وقت مجھے ایک روپیہ قرض دے سکتے ہوں تو میں ہمیشہ ...."

منشی جی مڑے "میاں جمّن میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تنگی میں ہو مگر تم تو خود جانتے ہو کہ میرا اپنا کیا حال ہے۔ روپیہ تو روپیہ ایک پیسہ

تک میں تمہیں نہیں دے سکتا، اگر میرے پاس ہوتا تو بھلا تم سے چھپانا تھوڑا ہی تھا، تمہارے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی پہلے ہی جو کچھ ہوتا تمہیں دے دیتا۔"

باوجود اس کے جمّن نے اصرار شروع کیا "منشی جی! قسم لے لیجیے میں ضرور آپ کو تنخواہ ملتے ہی واپس کر دوں گا، سچ کہتا ہوں حضور اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ......"

منشی جی اس جھک جھک سے بہت گھبراتے تھے۔ انکار چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ شروع سے چاہتے تھے کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔

اتنے میں سینما ختم ہوا اور تماشائی اندر سے نکلے۔

"ارے میاں برکت، بھئی تم کہاں؟" کسی نے پہلو سے پکارا۔

منشی جی جمّن کی طرف سے اُدھر مُڑے۔ ایک صاحب موٹے تازے، تیس پینتیس برس کے۔ انگرکھا اور دوپلّی ٹوپی پہنے، پان کھائے، سگریٹ پیتے ہوئے منشی جی کے سامنے کھڑے تھے۔

منشی جی نے کہا "اخّاہ تم ہو! برسوں کے بعد ملاقات ہوئی، تم نے لکھنؤ تو چھوڑ ہی دیا؟ مگر بھائی کیا معلوم آتے بھی ہوگے تو ہم غریبوں سے کیوں ملنے لگے!"

یہ منشی جی کے پُرانے کالج کے ساتھی تھے۔ روپئے، پیسے والے رئیس آدمی، وہ بولے:

"خیر یہ سب باتیں تو چھوڑو، میں دو دن کے لیے یہاں آیا ہوں، ذرا لکھنؤ میں تفریح کے لیے، چلو اس وقت میرے ساتھ چلو تمہیں وہ مجرا سنواؤں کہ عمر بھر یاد کرو، میری موٹر موجود ہے، اب زیادہ مت سوچو، بس چلے چلو سنا ہے تم نے کبھی نورجہاں کا گانا؟ اہاہا کیا گاتی ہے کیا بتاتی ہے، کیا

ناچتی ہے، وہ ادا، وہ پھبن، اس کی کمر کی لچک، اس کے پاؤں کے گھنگھرو کی جھنکار! میرے کان پر، کھلے صحن میں، تاروں کی چھاؤں میں، محفل ہوگی۔ بھیروی سن کر جلسہ برخاست ہوگا۔ بس اب زیادہ نہ سوچو، چلے ہی چلو۔ کل اتوار ہے........ بیوی! بیگم صاحبہ کی جوتیوں کا ڈر ہے، اگر ایسا ہی عورت کی غلامی کرنا تھی تو شادی کیوں کی؟ چلو بھی میاں! لطف رہے گا، روٹھی بیگم کو منانے میں بھی تو مزہ ہے......"

پُرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش منشی جی لپک کر موٹر میں سوار ہو لیے۔ جمّن کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔

دُلاری

سجّاد ظہیر

گو کہ بچپن سے وہ اِس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولہویں سترہویں برس میں تھی کہ آخرکار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے گھرانے میں ماشاء اللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحبہ بھی بقیدِ حیات تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دُلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں نوکرانیاں اور مامائیں آتیں۔ مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں اس کے بعد ذرا سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں اور چلی جاتیں مگر دلاری کے لیے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دُلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیوں کے مقابلے میں اس کی حالت اچھی ہی تھی۔ مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اُس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں"۔ اِس کا دُلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بی بیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ یہ تو سب خدا

کا کیا دھرا ہے، وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے اس کا رونا کیا؟ دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن کا ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری بیچینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی۔ لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاجزادی حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہمسن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیاں فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاجزادی کیونکہ شریف تھیں ان کا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے، میں صرف ہونے لگا۔ دُلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی۔ وہ خوبصورت تھی۔ کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ اپنے رکھاؤں کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی، یا اگر کبھی شاذونادر اسے بیگم صاحبہ یا صاجزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی۔ دُلاری گڑیا بنی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے نوکر چاکر کھڑے تماشہ دیکھتے۔ بچّے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاجزادے کاظم بھی موجود تھے۔ جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحبہ انھیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انھیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی، یہ اکثر پرانی رسموں کے خلاف تھے مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

انھیں پیاس لگی، اور انھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کہا "امی جان پیاس لگی"۔

بیگم صاحبہ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا "بیٹا شربت پیو، میں ابھی بنواتی ہوں" اور یہ کہہ کر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے "جی نہیں امی جان، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، مَیں خود اندر جاکر پانی پی لوں گا" مگر دلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل دی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چن رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہنچ کر رُکے۔

دلاری نے مڑکر پوچھا "آپ کے لیے کونسا شربت تیار کروں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دُلاری کو آنکھ بھر کے دیکھا، دُلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر الگ رکھ دی اور اسے گلے سے لگالیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے، جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئے۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جارہے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دُلہن آجائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے کام کی کثرت ہے۔ دُلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی، بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا، لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی اور وہی اسے چھپائے ہوئے

ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا۔ بڈھا بے چارہ بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے، وہ راضی ہو گئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچے گی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھل بلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے سر سے پیر تک ایک سفید چادر اُڑھے، پریشان صورت، اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جاکر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑے ہو کر اسے دیکھتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آگئی ہے، تو وہ باہر نکلے جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے، انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا "بے وقوف، اب ایسی حرکت نہ کرنا!" اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحب زادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دُلاری کے پاس پہنچیں، مگر بہت قریب نہیں، اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی دلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر بہت ترس آرہا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہوئی باہر قدم تک رکھ سکتی ہے، اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت، یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی؟

دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا، جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی، مگر اس کی اسے کافی سزا مل گئی، خدا بھی گنہ گاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لیے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لیے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا:

"دلاری یہ تو نے کیا کیا؟"

دلاری نے گردن اٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لیے اپنے بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا۔

حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحبہ آ گئیں۔ ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ دلاری کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحبہ نے اسے ڈانٹنا شروع کیا "بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ، مگر منہ کالا کر کے سارا زمانہ تجھ پر تھُڑی تھُڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحبہ اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام اُتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے، سب گھر والے بیگم صاحبہ اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھ کر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مُردار خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بیکس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں، بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

یکا یک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوب صورت دُلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دُلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے

سے غصہ نمایاں تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجہ میں کہا:
"امی خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے، وہ کافی سزا پا چکی ہے آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے!"
لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے، جب اس کے کان پیار کے لفظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اس کے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش، اسی بیدلی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے! اس روحانی کوفت نے دلاری کو اُس وقت نسوانی حمیّت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پُرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہو گئی۔

پھر یہ ہنگامہ.....

سجّاد ظہیر

"مذہب دراصل بڑی چیز ہے۔ تکلیف میں، مصیبت میں، ناکامی کے موقعہ پر، جب ہماری عقل کام نہیں کرتی اور ہمارے حواس مختل ہوتے ہیں، جب ہم ایک زخمی جانور کی طرح چاروں طرف ڈری ہوئی بے بسانہ نظریں دوڑاتے ہیں، اس وقت وہ کون سی طاقت ہے جو ہمارے ڈوبتے ہوئے دل کو سہارا دیتی ہے؟ مذہب! اور مذہب کی جڑ ایمان ہے۔ خوف اور ایمان۔ مذہب کی تعریف لفظوں میں نہیں کی جاسکتی۔ اسے ہم عقل کے زور سے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک اندرونی کیفیت ہے......"

"کیا کہا؟ اندرونی کیفیت؟"

"یہ کوئی ہنسنے کی بات نہیں، مذہب ایک آسمانی ضیا ہے جس کے پرتو میں ہم کائنات کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ یہ ایک اندرونی......"

"خدا کے واسطے کچھ اور باتیں کیجیے، آپ کو اس وقت میری اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں معلوم ہوتا۔ میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے اس وقت مجھے آسمانی ضیا کی ضرورت بالکل نہیں۔ مجھے جلاب....."

ایک بار رات کو میں ناول پڑھنے میں محو تھا کہ چپکے سے کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جو آنکھ اٹھائی تو کیا دیکھا کہ میاں ابلیس کھڑے ہیں۔

میں نے کہا "ابلیس صاحب! اس وقت آخر آپ کی مراد میرے یہاں آنے سے کیا ہے، مَیں ایک بہت دلچسپ ناول پڑھنے میں مشغول ہوں، خواہ مخواہ آپ پھر چاہتے ہیں کہ میں کتاب بند کر کے آپ سے مذہبی بحث شروع کر دوں۔ میرے نزدیک ناول پڑھنا مذہبی باتوں میں سر کھپانے سے بہتر ہے۔ آپ نے جو میرے دل میں وسوسہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں ہرگز اس کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔"

میرے اس کہنے پر وہ ابلیس نما شخص مڑا اور کمرے کے باہر جانے لگا۔ اس طرح ایک فرشتے کے ساتھ برتاؤ کرنے پر میرا دل مجھے کچھ کچھ ملامت کرنے لگا ہی تھا کہ وہ شخص یکبارگی میری طرف پلٹا اور افسوس بھری آواز میں مجھ سے کہا:

"مَیں ابلیس نہیں جبرئیل ہوں۔ مَیں تم پر اس کا الزام نہیں رکھنا چاہتا کہ تم تم نے مجھے ابلیس کہا۔ ابلیس بھی آخر میرا ہی ایسا ایک فرشتہ ہے۔ تم تو کیا تم سے بڑے لوگوں نے اکثر مجھے ابلیس سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔ پیمبروں تک سے یہ غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اچھائی کا فرشتہ ہوں میری صورت سے تقدس ٹپکتا ہے۔ اگر ابلیس کی طرح میں حسین ہوتا تو شاید لوگ مجھ سے اس طرح کا برتاؤ نہ کرتے۔ اور بھلا آپ یہ کیسے سمجھے کہ مَیں آپ سے مذہبی بحث کرنا چاہتا ہوں؟ مجھے بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ ہر بحث چونکہ وہ عقل اور منطق پر مبنی ہوتی ہے شیطانی چیز ہے۔ مذہب کی جڑ ایمان ہے اگر تمہاری جڑ مضبوط ہے تو پھر خدا خود مذہبی بحث میں تمہارا ساتھ دیتا ہے اور جب مددِ خدا شامل حال ہو تو پھر عقل سے کیا سروکار؟ مذہب دراصل بڑی اچھی چیز ہے......"

عقل اور ایمان، آسمان اور زمیں، انسان اور فرشتہ، خدا اور شیطان، میں کیا سوچ رہا ہوں؟ سوکھی ہوئی خشک زمین برسات میں بارش سے

سیراب ہو جاتی ہے اور اس میں سے عجب طرح کی خوشگوار، سوندھی خوشبو آنے لگتی ہے۔ قحط میں لوگ بھوکے مرتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان، عورت، مرد آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے زرد، ہڈیاں، پسلیاں جھری پڑی ہوئی کھال کو چیر کر معلوم ہوتا ہے باہر نکلی پڑ رہی ہیں۔ بھوک کی تکلیف، ہیضہ کی کی بیماری، قے، دست، مکھیاں، موت۔ کوئی لاشوں کو گاڑنے یا جلانے والا نہیں، لاشیں سڑتی ہیں اور اُن میں سے عجب طرح کی بدبو آنے لگتی ہے۔

ایک رئیس کے یہاں ایک ولائتی کتا پلا تھا۔ اس کا نام تھا شیرا۔ اس کے لیے روزانہ کا راتب مقرر تھا، اور وہ عام طور سے گھر کے احاطہ کے اندر ہی رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بازاری کتیوں کے پیچھے البتہ بھاگتا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تب اس کی یہ عادت بھی بڑھی۔ محلّے میں اور جو دبلے، پتلے، بازاری کتّے تھے وہ جب شیرا کو آتا دیکھتے تو اپنی کتیوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے اور دور سے کھڑے ہو کر شیرا پر بھونکتے۔ شیرا کتیوں کے ساتھ رہتا اور ان کتّوں کی طرف رخ بھی نہ کرتا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ بڑا بھاری شیرا سے تقریباً دونے جسم کا بازاری کتّا اِس محلّے میں کہیں آگیا اور وہ شیرا سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ دو ایک دفعہ شیرا سے اور اس سے جھڑپ بھی ہوئی۔ ایسے موقع پر کتیاں تو سب بھاگ جاتیں اور سارے بازاری کتّے اپنے گروہ کے پیشوا کے ساتھ مل کر شیرا پر حملہ کرتے۔ رفتہ رفتہ شیرا کا اپنے گھر سے باہر نکلنا ہی نہ صرف بند ہو گیا بلکہ بازاری کتّوں کا گروہ اُلٹے شیرا پر حملہ کرنے کے لیے اس کے احاطہ کے اندر آنے لگا۔ جب اس قسم کا حملہ ہوتا تو گھر میں کتّوں کے بھونکنے کی وجہ سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی۔ نوکر وغیرہ جو قریب ہوتے وہ شیرا کو چھڑانے کے لیے لپکتے اور بڑی بڑی مشکلوں سے شیرا کو اس کے دشمنوں سے بچاتے۔ شیرا کئی دفعہ زخمی ہوا اور اب گھر کے اندر چھپا بیٹھا رہتا۔ بازاری کتّوں کی پوری فتح ہو گئی۔ ایک دن علی الصبح شیرا اپنے گھر

کے احاطہ میں پھر رہا تھا کہ باہر والے کتوں کے گروہ نے بڑے کتے کی سرکردگی میں اُس پر حملہ کیا۔ گھر میں سب سو رہے تھے، مگر غل اور شور اتنا ہوا کہ لوگ جاگ اُٹھے۔ رئیس صاحب جن کا کتا تھا اندر سے باہر نکل پڑے اور اس ہنگامے کو دیکھ کر اپنی بندوق اٹھالائے۔ انھوں نے بڑے بازاری کتے پر نشانہ لگا کر فیر کیا اور اس کا وہیں خاتمہ کر دیا، باقی کتے بھاگ گئے۔ شیراز خمی شدہ اپنے مالک کے قدموں پر آکر لوٹنے لگا۔ کمینے، رذیل بازاری کتوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ شریف، خاندانی، ولائتی کتا سلامت رہ گیا اور پھر اس طرح سے مزے کرنے لگا۔

انسانیت کسے کہتے ہیں ؟

گومتی ہزاروں برس سے یوں ہی بہتی چلی جا رہی ہے۔ طغیانیاں آتی ہیں، آس پاس کی آبادی کو مٹا کر دریا پھر اسی رنگ سے آہستہ آہستہ بہنے لگتا ہے۔ دریا کے کنارے ایک جگہ ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ اس مندر کی نیو معلوم ہوتا ہے بالو پر تھی۔ بالو کو دریا کے دھارے نے کاٹ دیا۔ مندر کا ایک حصہ جُھک گیا۔ اب مقدر (مندر۔ خ ع) ترچھا ہو گیا مگر ابھی تک قایم ہے۔ تھوڑے دن کے بعد بالکل مسمار ہو جائے گا۔ تھوڑے دن تک کھنڈر کا نشان رہے گا۔ اس کے بعد مندر جہاں پہلے تھا وہاں سے دریا بہنے لگے گا۔

آج تیوہار ہے، نہان کا دن ہے۔ صبح سویرے سے دریا کے کنارے کے مندروں اور گھاٹوں پر بھیڑ ہے۔ لوگ منتر پڑھتے ہیں اور ڈبکیاں لیتے جاتے ہیں۔ دریا کا پانی میلا معلوم ہوتا ہے۔ لہروں پر گیندے اور گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں اوپر نیچے ہوتی ہوئی بہتی چلی جا رہی ہیں۔ کہیں کہیں کناروں پر جا کر بہت سے پھول، پتیاں، چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑے پیے ہوئے سگریٹ، عورتوں کے کپڑوں سے گری ہوئی سنہری چمکیاں، مردہ مچھلی اور اسی قسم کی اور چیزیں اکٹھے ہو کر رک گئی ہیں۔

گومتی ندی، شیر اکتا، مردہ مچھلی، آسمان پر بہتے ہوئے بادل اور زمین پر سڑتی ہوئی لاشیں، ان پر رحمت خداوندی اپنا سایہ کیے ہوئے ہے۔

کلّو مہتر کے جوان لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا۔ برسات کا موسم تھا، وہ صحن میں زمین پر سو رہا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے، اس کی بائیں کہنی کے قریب سانپ نے کاٹا۔ اس کو خبر تک نہیں ہوئی۔ پانچ بجے صبح کو وہ اٹھا، بازو پر اس نے نشان دیکھے، خفیف سی تکلیف محسوس کی۔ اپنی ماں کو اس نے یہ نشان دکھائے اور یہ خیال کر کے کہ کسی کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کا نشان ہے، وہ جھاڑو دینے میں مشغول ہو گیا۔ کلّو مہتر اور اس کے سارے بیوی بچے ایک گھر میں نوکر تھے۔ ان کی پندرہ روپیہ مہینہ تنخواہ تھی، رہنے کے لیے شاگرد پیشہ میں ایک کوٹھری تھی جس میں کلّو، اس کی بیوی، اس کی دو لڑکیاں اور اس کا لڑکا، سب کے سب رہتے تھے۔ پندرہ روپیہ مہینہ، ایک کوٹھری اور کبھی کبھی بچا ہوا جوٹھا کھانا اور پھٹے پرانے کپڑے، کلّو کو جن صاحب کے یہاں یہ سب کچھ ملتا تھا وہ ان کو خدا سے کم نہیں سمجھتا تھا کلّو کا لڑکا دس پندرہ منٹ سے زیادہ کام نہ کر سکا، اس کا سر گھومنے لگا اور اس کے بدن بھر میں سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ چھ بجتے بجتے وہ پلنگ پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اس کے منہ سے پھین نکلنے لگا، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زہر اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا اور موت نے اسے اپنے بیدرد شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس کے ماں باپ نے رونا شروع کیا۔ سارے گھر میں خبر مشہور ہو گئی کہ کلّو کے لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا۔ سب نے دوا درمن تجو بز کیا۔ کلّو کے آقا کے صاحبزادے بہت زیادہ غریب پرور اور رحمدل تھے۔ وہ خود کلّو کی کوٹھری تک آئے اور کلّو کے لڑکے کو خود انھوں نے اپنے ہاتھ سے چھوا اور دوا پلائی، مگر کلّو کی اندھیری کوٹھری اتنی زیادہ گندی تھی اور اس میں اتنی بدبو تھی کہ صاحبزادے سے چار پانچ منٹ بھی نہ ٹھہرا گیا۔

رحمدلی اور غریب پروری کی آخر ایک انتہا ہوتی ہے۔ وہ واپس تشریف لاکر اچھی طرح نہائے، کپڑے بدل کر رومال میں عطر لگاکر سونگھا تب جاکر ان کی طبیعت درست ہوئی۔ رہا کلّو کا لڑکا وہ بدنصیب ایک بجے کے قریب مر گیا۔ اس کی کوٹھری سے رونے پیٹنے کی آواز رات تک آتی رہی، جس کی وجہ سے سارے گھر میں اداسی چھاگئی۔ تجہیز و تکفین کے لیے کلّو نے دس روپیے پیشگی لیے۔ رات کو آٹھ، نو بجے کے قریب کلّو کے لڑکے کی لاش اٹھ گئی۔

حامد صاحب اپنی رشتہ کی بہن سلطانہ پر عاشق تھے۔ حامد صاحب نے سلطانہ بیگم کو صرف دور سے دیکھا ہے۔ ایک دو لفظوں کے علاوہ کبھی آپس میں ان سے دیر تک باتیں نہیں ہوئیں مگر عشق کی بجلی کے لیے لفظوں کی گفتگو کی، جان پہچان کی کیا ضرورت؟ حامد صاحب دل ہی دل میں جلا کرتے، جھوم جھوم کر شعر پڑھتے، اور کبھی کبھی جب عشق کی شدت ہوتی تو غزل لکھ ڈالتے اور رات کو دریا کے کنارے جاکر چپ بیٹھتے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے۔ صرف ان کے دو گہرے دوست حامد کے عشق کا راز جانتے تھے۔ اس طرح اپنے دل کی آگ چھپانے پر وہ حامد کی تعریف کیا کرتے تھے، شرفا کا دستور یہی ہے: دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا

شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا!

حامد ہفتہ میں ایک بار سے زیادہ شاید ہی اپنے چچا کے گھر جاتے رہے ہوں۔ مگر جانے کے ایک دن پہلے سے ان کی بے چینی کی انتہا نہ رہتی۔ شاعر نے ٹھیک کہا ہے:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتش شوق تیز تر گردد

ان کے دوست جب حامد کی یہ کیفیت دیکھتے تو مسکراتے اور ذیل کا شعر پڑھتے:

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

حامد صاحب شرماتے، ہنستے، خفا ہوتے، گھبراتے، دل پر ہاتھ رکھتے اور اپنے دوستوں سے التجا کرتے کہ انھیں چھیڑیں مت۔

سلطانہ بیگم شریف زادی ٹھہریں عشق یا محبت کے الفاظ، باعصمت بہو بیٹیوں کی زبان تک آنا نامناسب ہیں۔ انھوں نے اپنے حامد بھائی سے آنکھ ملاکر شاید ہی کبھی بات کی ہو مگر جب وہ حامد بھائی کو اپنے سامنے گھبراتے اور جھینپتے دیکھتیں تو دل ہی میں سوچتیں کہ شاید عشق اسی چیز کا نام تو نہیں! حامد بیچارے کو پاک محبت تھی اس لیے اگر کبھی سلطانہ بیگم اور وہ کمرے میں چند منٹ کے لیے اکیلے رہ بھی جاتے تو سوائے اس کے کہ وہ ڈرتے ڈرتے بہت دبی ہوئی ایک ٹھنڈی سانس لیں اور کسی "ناجائز" طریقہ سے اظہار عشق نہ کرتے۔ ایک مدت تک عشق کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔

جب حامد صاحب کی نوکری ہوگئی تو ان کے دل میں شادی کا خیال آیا۔ ان کے والدین کو بھی اس کی فکر ہوئی۔ سلطانہ بیگم کی والدہ بھی اپنی بچی کے لیے بَر کی تلاش میں تھیں۔ حامد صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی والدہ کو اس بات سے آگاہ کروادیا کہ وہ سلطانہ بیگم سے شادی کرنی چاہتے ہیں۔

شادی کا پیام بھیجا گیا۔ مگر سلطانہ بیگم کی والدہ کو حامد میاں کی والدہ کی صورت سے نفرت تھی۔ ہمیشہ سے ان دو خاتونوں میں عداوت اور دشمنی تھی حامد میاں کی والدہ اگر اچھے سے اچھا کپڑا اور زیور بھی پہنے ہوتیں تب بھی سلطانہ بیگم کی ماں، ان پر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور کستیں، اور ان کے لباس میں کچھ نہ کچھ عیب ضرور نکالتیں۔ اگر ایک کے پاس کوئی زیور ہوتا، جو دوسرے کے پاس نہ ہوتا تو دوسری بیگم ضرور آئندہ ملاقات کے موقع پر اس سے بہتر اسی قسم کا زیور پہنے ہوتیں۔ ایک سے برخاست شدہ ماما کو دوسرے گھر میں ضرور نوکری ملتی۔

حامد میاں کے گھر سے جب شادی کا پیام آیا تو سلطانہ بیگم کی والدہ نے

ہنس کر بات ٹال دی۔ انھوں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑا رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ پہلے سلطانہ بیگم کے لیے کوئی بر ڈھونڈھ لیں اس کے بعد حامد میاں کی نسبت سے صاف صاف انکار کر دیں۔ حامد میاں کی والدہ ان ترکیبوں کو خوب سمجھتی تھیں، ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب خاندان میں اچھا خاصہ، صحیح سالم، کماتا کھاتا، سعادت مند لڑکا موجود ہو تو سلطانہ کی گھر سے باہر شادی کرنے کے کیا معنی؟

مگر حامد کو عشق صادق تھا، انھوں نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ کوشش کیے جائیں۔ یوں ہی ایک مدت گزر گئی۔ کچھ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلطانہ بیگم کی والدہ کو اپنی لڑکی کے لیے اس درمیان میں کوئی مناسب بر بھی نہیں ملا۔ سلطانہ بیگم کی عمر اُنیس برس کی ہو گئی۔ اِن کی والدہ اب زیادہ انتظار نہ کر سکیں، آخر کار وہ رضامند ہو گئیں۔

حامد میاں کی سلطانہ بیگم سے شادی ہو گئی۔ ان کی شادی ہوئے دو برس سے کچھ زیادہ ہو گئے۔ عاشق کی مراد بر آئی۔ خدا کے فضل سے گھر میں دو بچے بھی ہیں۔

ایک غریب عورت ایک تاریک اندھیری کوٹھری میں ایک ٹوٹی ہوئی جھلنگی چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے۔ درد کی تکلیف اتنی ہے کہ سانس نہیں لی جاتی۔ رات کا وقت ہے اور سردی کا موسم۔ عورت کے بچّہ ہونے والا ہے۔

ایک اندھیری رات میں ایک غریب عورت، سب سے چھپا کر چپکے سے اپنے غریب عاشق سے ملنے گئی۔ جب اس عورت کو موقعہ ملتا وہ اس مرد سے ملنے جاتی۔

عشق کی لذت، موت کی تکلیف۔ یہ پہاڑ جن کی چوٹیاں نیلے آسمان سے جا کر ٹکراتی ہیں کیوں کھڑے ہیں؟ سمندر کی لہریں۔

گھڑی کی ٹِک ٹِک اور پانی کے ایک ایک قطرے کے ٹپکنے کی آواز، اور خاموشی، اور دل کی دھڑکن، محبت کی ایک گھڑی، رگوں میں خون کے دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ آنکھیں گفتگو کرتی ہیں اور سنتی ہیں۔ سور، پاجی، اُلّو، حرامزادہ...... گالیاں اور سخت تیز دھوپ، جو کھال کو معلوم ہوتا ہے جھلسا کر ہڈی تک پگھلا دے گی۔ ایک زمیندار اور ان کا کاشت کار، جس کے پاس لگان دینے کے روپئے نہیں۔ صاحبزادے نے والد کو دوسرا خط بھیجا ہے جس میں اُن سے بہ تاکید روپئے مانگے ہیں وکالت کے امتحان کی فیس چار دن کے اندر جانی ضرور ہے۔ والد صاحب اپنے صاحبزادے کی تعلیم کے لیے کاشت کار سے روپے وصول کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سانپ رینگ رہے ہیں۔ کالے کالے، لمبے لمبے۔ پھن اٹھا اٹھا کر جھوم رہے ہیں۔ اِن کو کون مارے؟ کس چیز سے ماریں؟

برسات میں بادل کی گرج، اور پہاڑوں کی تنہائی میں ایک چشمے کے بہنے کی آواز، لہلہاتے ہوئے شاداب کھیت اور بندوق کے فیر کی تڑاتے دار صدا، اس کے بعد ایک زخمی سارس کی دردناک قائیں، قائیں قائیں۔

بادل نہیں آتے

احمد علی

اور بادل نہیں آتے، نگوڑے بادل نہیں آتے۔ گرمی اتنی تڑاخے کی پڑ رہی ہے کہ معاذ اللہ! تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح بھنے جاتے ہیں، تمازت آفتاب اور دھوپ کی تیزی! بھاڑ بھی ایسا کیا گرم ہوگا، پوری دوزخ ہے۔ کبھی دیکھی بھی ہے؟ نہیں دیکھی تو اب مزا چکھ لو۔ وہ موئی چلچلاتی دھوپ ہے کہ اپنے ہوشوں میں تو دیکھی نہیں۔ چیل انڈا چھوڑتی ہے، ہرن تو کالے ہوگئے، ہوں گے۔ بھئی کوئی پنکھے ہی کو تیز کر دو، سکون تو ہو جاتا ہے۔

خاموشی، خاموشی، بستی اور پستی اور پستی اور مستی۔

بچپن میں سنتے تھے کہ ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا غار ہے۔ اونچے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، سخت اور گھنے، اور ایک پہلو میں ایک موکھا، بڑا اور عمیق اور اندھیرا ـــــ اور اس کے منہ پر ایک بڑی چٹان رکھی رہتی ہے۔ اس غار میں بادل بند رہتے ہیں، سفید اور بھوری اور کالی گائیں بند رہتی ہیں۔ کیا کیا بھی احمق خیالات ہوتے ہیں۔ جہالت کی بھی کوئی حد ہے کتنا ہی سمجھاؤ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک ہی لاٹھی سے بیل اور بکریوں کو ہانکتے ہیں۔ ہم کوئی کتے ہیں کہ بھونکے چلے جائیں؟ بھوں، بھوں، بھوں! کوئی سنتا تک نہیں۔ عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ ارے کوئی تو بتاؤ عقل بڑی کہ بھینس۔ بھینس بڑی ہے بھینس، بھینس عقل کی دم میں نمدا۔ زیادہ کہو تو

ڈنڈاے کے بل پڑے۔ مولویوں کے بھی کہیں عقل ہوتی ہے؟ عقل، عقل، صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ اور داڑھی نے قلب پر سیاہی چھا رکھی ہے۔ دماغ کو استعمال نہیں کرتے۔ سمجھ کو چھپّر پر رکھ دیا۔ طاق میں سے کتاب اُتاری، ہل ہل کے پڑھ رہے ہیں، جُھک جُھک کے پڑھ رہے ہیں۔ واہ میاں مٹھّو، واہ! خوب بولے! پڑھو، میاں مٹھو، پڑھو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ، پاک نبی رسول اللہ۔ نبی جی بھیجو۔ یا اللہ بھیج! مولوی صاحب۔ بچّہ کی تمنا ہے سخت آرزو ہے۔ نہ معلوم کیا گناہ کیا ہے جس کی سزا مل رہی ہے۔ گھبرایئے نہیں، دو تعویذ دیتا ہوں۔ حقیر فقیر، ناچیز و گنہگار ہوں۔ لیکن کلام الٰہی ہے، انشاء اللہ مراد حاصل ہوگی۔ عشاء کے بعد غسل کرکے سات بار درود شریف پڑھ کر لوبان کی دھونی کے ساتھ ہمبستری کے وقت زیر ناف باندھ دیجیے گا، دوسرا پانی میں گھول کر ایک صراحی یا کسی اور برتن میں رکھ دیجیے گا اور سات روز آب زمزم ملا کر نہار منہ پی لیا کیجیے گا۔ اگر خدا نے چاہا تو مراد ضرور برآئے گی۔ یہ نذرانہ ہے۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ! تم کو شرم نہیں آتی؟ سمجھتے ہو کہ اللہ کا کلام خریدا جا سکتا ہے؟ خدا کو بھی مول لوگے؟ میں نذرانہ وذرانہ نہیں لیتا۔ جاؤ کسی ٹٹپونجیے کے پاس؛ جاؤ، بھاگ یہاں سے! نکل! حضت سخت قصور ہوا۔ معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی گستاخی نہ ہوگی۔ اچھا خیر! جا، لیکن بات یاد رکھنا، نوچندی جمعرات کو بڑے پیر صاحب کی نیاز دلوا دینا اور سوا روپیہ اور پاؤ بھر موتیا کے پھول ہرے بھرے صاحب کے مزار پر چڑھا دینا۔ قہ آری صوا آحبیب اا آپ کی دستا آر موبا آرک میں خہ تن گا آ آ۔ مولوی صاحب کھائی۔ ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اجی مولوی صاحب کھائی۔ ہاں، ہاں بیٹا خوب کھائی۔ نہیں مولوی صاحب کھائی! ابے کہہ تو دیا کھائی، ہاں خوب کھائی۔ ادب!! انگریزوں کو خدا غارت کرے۔ انگریزی پڑھا پڑھا کر دہریہ بنا ڈالا۔ زنخا بنا ڈالا، مردانگی کی ناک کاٹ کے لے گئے۔

نہ دوزخ کا ڈر نہ جنت کی خواہش۔ بڑھاپڑھایا سب خاک میں ملا دیا۔ ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں؛ خدائے پاک پر ہنستے ہیں۔ جب آگ میں جلیں گے تو، اور ایک سادھو اُس غار کا منہ برسات میں کھول دیتا ہے۔ بادل بھڑبھڑاڑ نکلتے ہیں سن سن سکھی پنکھی کا بیاہ ہوتا تھا...... تا ئل ممولہ ناچتی تھی..... بلبل تو خوب بولا پود ناستائی..... تیتری بھنبھیری، سب کو کہ نال تیری...... پر تلی جو نائن آئی ساری صبا بھگائی۔ بھاڑ، بھاڑ، سب برات اُڑگئی۔ اب تو ہوا اُکھڑگئی؛ ہوا۔ ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے۔ خدا نیک ہدایت دے۔ سچ ہے قیامت کے سب آثار موجود ہیں۔ آگ اُگلتا ہوا سانپ! تفرقے، جھگڑے لڑائیاں، مذہب اور خدا کی توہین: زمین کا طبقہ پلٹ رہا ہے۔ جب یونان کا طبقہ اُلٹا تھا تو یہ ہی سب علامات موجود تھیں۔ یا اللہ رحم کر! یہ جاہل ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تو رب العالمین ہے! ان کو معاف کر۔

بادل کیوں نہیں آتے؟ اور زندگی وبال ہے۔ وبال، وبال۔ لمبے لمبے، کالے کالے بال۔ ایک فضول کی لادی لدی ہوئی ہے۔ آخر ہم بھی مردوں کی طرح کیوں نہیں کٹوا سکتے؟ چھوٹے چھوٹے بالوں سے سر کیسا ہلکا معلوم ہوتا ہوگا۔ خدا بخشے ابا جان کے تو خشخاشی تھے۔ ایک مرتبہ ایسی ہی گرمی پڑی تو پان بھی بنوا لیا تھا اور میں نے اور صابرہ نے خوب ہی سر سہلایا۔ کاش کہ ہمارے بال بھی کٹے ہوتے۔ گدی تو جلی جاتی ہے، جھلسی جاتی ہے۔ اس پر بھی بال نہیں کٹوا سکتے۔ خاندان والوں کی کیا بڑی ناک ہے۔ ہم جو بال کٹوا لیں گے تو ان کی ناک کٹ جائے گی۔ اگر میں کہیں لڑکا ہوتی تو کھونڈی چھری سے کاٹ ڈالتی، جڑ سے اُڑا ڈالتی۔ اور جب ناک ہی نہ رہتی تو کٹنے کا ڈر کہاں؟ خدا گنجے کو ناخون ہی نہیں دیتا۔ زخم کے بھرنے تک ناخون نہ بڑھ آئیں گے کیا؟ زخم تو بھر آیا لیکن ناخون ہی نہیں جو زخم زخم ــــ رحم، ارحم الراحمین۔ کیا خدا بھی رحموں کے مجموعہ سے بنا ہے؟ آخر ہم ہی میں رحم کو کیوں پیدا کیا؟

عورت کمبخت ماری بھی کیا جان ہے، بچھڑی سے بدتر۔ کام کرے، کاج کرے، سینا پرونا، کھانا پکانا، صبح سے رات تک جلے پاؤں بلّی کی طرح ادھر پھرنا اُدھر پھرنا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ بچے جننا۔ جی چاہے یا نہ چاہے جب میاں موئے کا جی چاہا، ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ اِدھر آؤ میری جانی، میری پیاری۔ تمہارے نخرے میں گرم مصالح۔ دیکھو تو کمرہ میں کیسی ٹھنڈک ہے! میرے کلیجہ کی ٹھنڈک! وے آؤ، ہٹو پرے۔ تم پر ہر وقت کمبخت شیطان ہی سوار رہتا ہے! ان دن دیکھو نہ رات۔ ہار، مار ڈالو کٹاری مارونا۔ ہاتھ نگوڑا مروڑ ڈالا، توڑ ڈالا۔ کہاں بھاگی جاتی ہو؟ سینے سے چمٹ کے لیٹ جاؤ! دیکھو کٹاری کا مزہ چکھ لو۔ وہ ہی موئے دودھوں پر ہاتھ چل پڑے۔ سخت سخت انگلیوں سے مَسَل ڈالا، وسل ڈالا۔ کمبخت نے گھنڈی کو کس زور سے دبایا کہ ہل بھی نہ سکی۔ موا جوانا مرے، کوٹھے والیوں کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہ کرتا ہوگا۔ کمزور جان لیٹ گئی کہ سارا گرمی کا غصّہ مجھ ہی پر اُتارا۔ مُردے کی طرح کیوں پڑی ہو! کیا جان نہیں؟ زور لگاؤ۔ پیاری، پی آری۔ جہ آ آئی۔ اور ہم ہیں کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کیوں نہیں کچھ کر سکتے؟ اگر اپنا روپیہ ہوتا تو یہ سب ذلّت کیوں سہنی پڑتی۔ جس وقت جو جی چاہتا کرتے۔ کمانے کی اجازت بھی تو نہیں۔ پردے میں پڑے پڑے سڑتے ہیں۔ لونڈیوں سے بدتر زندگی ہے۔ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ پنجرے میں پڑے ہیں، قید کیے پڑے ہیں۔ پر بھی تو پھڑ پھڑانے کی گنجائش نہیں۔ ہماری زندگی ہی کیا ہے! بُجھا دیا تو بجھ گئے تھے، جلا دیا تو جل رہے ہیں۔ ہر وقت جلا کرتے ہیں جلنے کے علاوہ اور کچھ بھی ہماری قسمت میں ہے؟ اور فرماں برداری کریں مَردِ موئے سارے میں جوتیاں چٹخاتے پڑے پھرتے ہیں۔ کہیں بیٹھ کے حقّہ گُڑ گُڑایا! کہیں گپّیں کیں! کہیں گنجفہ، کہیں شطرنج، کہیں موئے تاش۔ رات کو اور کچھ نہیں تو چاوڑی چلے گئے۔ گانا سننے کا بہانہ! لیکن پھر صبح نہانا کیسا؟

اور کہہ کہہ کر ہمیں جلانا۔ کہیں جل بھی تو نہیں چکتے۔ لاکھ لاکھ آنسو بہلتے ہیں! موئی آگ ایسی چوبیس گھڑی کی لگی رہتی ہے کہ ذرا بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ موت بھی تو نہیں۔ ہندوؤں کی زندگی ہم سے کہیں اچھی ہے۔ آزادی تو ہے، عیسائیوں کا تو کیا کہنا۔ جو جی میں آتا ہے کوئی ہیں۔ ناچ ناچیں، تصویریں دیکھیں، بال کٹائیں۔ راوی چین لکھتا ہے۔ نہیں معلوم کس گھڑی ہماری پیدائش ہوئی۔ جو مسلمان گھر میں جنم لیا۔ آگ لگے ایسے مذہب کو۔ مذہب، مذہب، مذہب روح کی تسلّی، مردوں کی تسلّی ہے! عورت بیچاری کو کیا! پانچ انگشت لانبی داڑھی لگا کے بڑے مسلمان بنتے ہیں۔ ٹٹی کی آڑ میں شکار کرتے ہیں۔ ہمارے تو جیسے جان تلک نہیں۔ آزادی کے لیے تو دیوارِ قہقہہ ہیں۔ ابّا جان نے کس مصیبت سے اسکول میں داخل کیا تھا مشکل سے آٹھویں تک پہنچی تھی کہ خدا بخشے دنیا سے سدھار گئے۔ سب نے فوراً ہی تو اسکول سے نام کٹا دیا! اور اس موٹے مسٹنڈے، ڈاڑھی والے کے ساتھ نتھی کر دیا۔ موا شیطان ہے۔ عورت کی آزادی تو آزادی عورت کا جواب تک دینا گوارا نہیں کرتا۔

کیا سمندر سوکھ گئے، جو بادل نہیں آتے؟ سو گئے۔ سمندر بھی سوکھ گئے سمندر، سات سمندر پار سے آئے، ہماری بھی لُٹیا ڈوب گئی۔ غڑپ، غڑپ غڑپ، غوطے لگا رہے ہیں! اپنے ہی خون میں نہا رہے ہیں۔ دھوپ تو اتنی تیز ہے، بھاپ بھی نہیں بنتی۔ کاہے کی بھاپ بنے، خون تو خشک ہو گیا۔ جل کے راکھ ہو گیا۔ لیکن کیا سچ مچ بادل بھاپ کے بنتے ہیں؟ ہم تو سُنا کرتے تھے کہ بادل اسپنج کی طرح ہوتے ہیں! ہوا میں تیرا کرتے ہیں جب گرمی بہت سخت پڑی، پیاس کے مارے سمندر کے کنارہ اُتر پڑتے ہیں: خوب پانی پیتے ہیں اور پھر ہوا میں اُڑ جاتے ہیں اور توپوں کے خوف سے موتنے لگتے ہیں۔ تُلَل تُلَل موتنے لگتے ہیں۔ جو کچھ بھی اسکولوں میں

پڑھاتے ہیں، جھوٹ بکتے ہیں۔ بادل واقعی بھاپ کے نہیں ہوتے۔
جغرافیہ غلط، خوف برطانیہ درست، درست۔ یہ ہی بات ہے۔ اُوخو آج
سمجھ میں آیا۔ کیا سمجھے؟ بحری بیڑا اور توپ۔ لیکن افغان بھی کیا تپک مارتا
ہے۔ چٹانوں کی آڑ میں چھپا رہتا ہے۔ جہاں دشمن کو دیکھا، ایک آنکھ بھینچ
شاید دونوں ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ گھوڑا دبایا۔ ٹھائیں! ٹپ سے
زندہ جان مردہ کی طرح گر پڑی۔ خوب مارا! خوب۔ لیکن افغان تو پیدل
چلتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز کو ایک گولی سے گرا لیتا ہے۔ ہمارے پاس تو موٹر
چھوڑ اکا بھی نہیں۔ ہم کیا کریں گے؟ چلو جلیاں والے باغ کی سیر کر آئیں
مگر جائیں گے کاہے میں؟ ہم بتائیں، سرکنڈے کی گاڑی، دو بیل جوتے
جائیں۔ واہ بھئی واہ! خوب سُنائی۔ اتنے سارے آدمی اور سرکنڈے کی
گاڑی۔ پاگل ہے بھئی، پاگل۔ پیری ہے بے ملڈو، پیری ہے۔ سفیدے کی
پیری ہے۔ وہ کاٹا۔ یوں نہیں تو یوں سہی۔ ہُش ہُش میرے کان میں گھس
سب کو کان میں گھُسا لیں گے۔ پاگل ہے بھئی، پاگل ہے۔ وہ کاٹا! یہ ہی
تو مصیبت ہے سنتے تک نہیں۔ اِس کان سے سُنا، اُس کان سے نکال دیا،
جوں تک نہیں چلتی، گھڑا ابھی کیا چکنا ہوگا۔ مٹی میں پڑے رَوندتے ہیں!
صورت تک کو نہیں سنبھالتے۔ کیا شعر تھا؟ کیا؟ ہم نے اپنی صورت بگاڑ لی،
ان کو تصویر بنانی آتی ہے۔ کیا تھا؟ ایک ہم ہیں۔ ہاں، ہم! یہ ہی ہم جن کو
اپنی صورت کا احساس نہیں۔ کالے بھجنگے، میلے کچیلے، لنگوٹی میں مست
ہیں۔ بھائی بندوں میں سے کسی نے کوئی بات کہہ دی، لڑنے مرنے پر آمادہ
اور دوسرے جو گلا کاٹے ڈالتے ہیں اُس کا کچھ بھی نہیں۔ جوتے کھاتے ہیں؛
لاتیں سہتے ہیں، گالیاں سنتے ہیں اور پھر وہی لونڈوں کی سی بات، اب
کے تو مار، چاٹ! اچھا اب کے تو مار لیا۔ چاٹ! چاٹ! بھیں، بھیں، بھیں۔
دیکھو بی امّاں، چھنّو کا بچہ نہیں مانتا؛ جب سے بَرو بَر مارے جا رہا ہے۔ اُس کو

سمجھا تو نہیں تو اس حرامزادے کی ...... ماشاء اللہ، چشم بد دور، چشم بندوق کیا میٹھی گالی دی ہے، منہ چوم لے : منہ۔ زبان گدی کے پیچھے سے کھینچ کے نکال ڈالے۔ ایسا چانٹا مارے کہ سارا بھوڑا پن دور ہو جائے۔ کتّے کی طرح مارتے ہیں؛ ہڈی دکھا کے مارتے ہیں ؛ اجی پاس بلا کے مارتے ہیں؛ گھیر کے مارتے ہیں گھار کے مارتے ہیں؛ پیار کر کے مارتے ہیں، دُلار کر کے مارتے ہیں؛ اور تو اور، مار کر کے مارتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ کتّے کی ذات پھر اُن کے چوتڑوں میں گھسے جاتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ گومُتنک نہیں ملتا۔ آخ تھو۔ کالے کتّے کا گو! لعنت تم جیسوں پر۔ بس بے چھوٹم ؛ بس ؛ چُنّو کی گالی سہ لی۔ مار! مار! دیکھتا کیا ہے ؟ لپک کے ! دے دیا کے ہاتھ ! مار! اور راجہ ماری پودنی ہم بیر بساؤن جائیں۔ آپ کی صورت تو ملاحظہ ہو۔ کیا پدّی کیا پدّی کا شوربا۔ ہم بیر بساؤن جائیں۔ واہ میرے سینخ کے پہلوان، واہ ! کوئی پھبتی کہو، خدا لگتی کہو ہم بیر بساؤن جائیں ہاں، بیر کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ میاں شیخپورے کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کبھی سہارن پور کے بیروں کا بھی نام ہے ؟ اجی حضرت بیل ہوں گے، بیل۔ جی ہاں، بجا فرمایا، درست ؛ بیل ہی تو تھے۔ ہم بیر بساؤن جائیں ! سرکنڈوں کی گاڑی دو بیل جوتے جائیں —— اور ؟ راجہ ماری پودنی ہم بیر بساؤن جائیں۔ واہ میاں پودنے بڑی ہمت کی! مٹی کا شیر ہے نا ؛ سرکنڈوں کی گاڑی میں بیٹھے گا، بیلوں پر، کہ

راجہ ماری پودنی ہم بیر بساؤن جائیں۔

مہاوٹوں کی ایک رات

احمد علی

گڑ! گڑ! گڑر! الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گڑ ڑ ڑ ڑ!

اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اٹھیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ساری عمارت کو ہلا ڈالا۔ شُو شُو شُو ڈُو! کیا سردی ہے! تخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے۔

ایک چھوٹا سا مکان ۲۴ سے ۲۴ فٹ اور اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اس کے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا۔ کوئی فرش تک نہیں۔ کچھ پھٹے پرانے بوریے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور سیل سے چپ چپ کر رہے ہیں۔ کونوں میں بغچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے۔ ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق، اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے استعمال سے کالے ہو گئے ہیں، اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں۔ ان میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے، کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی، گھستے گھستے پیندا جواب دینے کے قریب ہے۔

چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں اور اس پر بارش! اللہ کیا مہاوٹیں اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؟ اب تو روک دو! کہاں

جاؤں، کیا کروں؟ اِس سے تو موت ہی آجائے۔ تو نے غریب ہی کیوں بنایا یا اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے۔ یا یہ حالت ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں، چھت چھلنی کی طرح ٹپکی جاتی ہے۔ بلّی کے بچوں کی طرح سب کونے جھانک لیے۔ لیکن چین کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، بچوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے۔ نہ معلوم سو بھی کیسے گئے ہیں۔ سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے! اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر! یا وہ زمانہ نہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے۔ آہ وہ میرا کمرہ! ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور شینیل کے تکیے۔ کیا نرم نرم توشک تھی کہ لیٹے سے نیند آجائے۔ اور لحاف؟ آہ! ارشمین چھینٹ کا، اور اس پر سچے ٹھپے کی گوٹ۔ انائیں، مامائیں کھڑی ہیں بیوی سر دباؤں؟ بیوی پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی ہے، کوئی ہاتھ مَل رہی ہے۔ گدگدا گدگدا بستر، اوپر سے یہ سب چونچلے، نیند ہے کہ کہکشانی کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے .... سبز شیشوں پر نیلے اور سرخ اور نارنجی عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سابوت ڈلے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں .... دسترخوان پر چاندی کی طشتریاں، ایک جھلاہٹ، قورما پلاؤ، بریانی، متنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے .... ایک باغ درختوں سے گھرا ہوا، جن کی کاہی پتّیوں پر تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے۔ واہ وا! کیا کیا خوش نما پھل ہیں۔ آم، منہ لال کلیجہ بال بال کا بغدادی بچّہ۔ سیب کیسے خوبصورت ہیں۔ اندھیرے اندھیرے درختوں میں سرخ اور گلابی اور پستئی لٹکے ہوئے ہیں، ڈالیوں سمیت جھکے ہوئے ہیں۔ ارے بیر تو دیکھو کیسے موٹے موٹے اور عنابی ہیں، شیخوپورے کے سے۔ ایک نہر اندھیری رات

ا۔ دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں کے بیر مشہور ہیں۔

میں چاندی کی چادر بچھی ہوئی ہے، شاید دودھ ہے۔ کہیں جنت تو نہیں؟ ایک کشتی بڑی آہستگی سے، بطخوں کی نزاکت سے بہتی ہوئی، جلدی آؤ، جلدی بیٹھ جاؤ، بہشت کی سیر کرائیں، کیا بیویاں ہیں، پاک صاف، بلّور جیسی گوری؟ اُجلے برّاق کپڑے، نزاکت ایسی جیسی ہوا کی، کشتی بہتے ہوئے چراغ کی طرح پانی پر چلی جا رہی ہے۔ دونوں طرف کھلے کھلے میدان۔ جو ہری ہری دوب سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں پھولوں کے رنگین تختے اور پھلوں کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جانور چہچہا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں تو کیا یہ جنت ہے؟ کیا ہم جنت میں ہیں؟ ہاں، بہشت، خدا کے نیک اور پیارے بندوں کی جگہ۔ کشتی کچھ چھوٹے چھوٹے سیپ کی طرح چمکدار اور گنبدوں کی طرح گول مکانوں کے سامنے سے گزری۔ کیا خوبصورتی اور کیا چمک ہے! نگاہ تک نہیں ٹھہرتی۔ ٹپکتے تو نہ ہوں گے؟ کیا ان میں مجھ کو بھی جگہ ملے گی؟ خدا کے نیک اور سچے بندوں کے لیے ہیں، پاک بندوں کے لیے۔ پیٹ میں ایک کھُرچن، کلیجہ میں ایک کھچاؤ؛ انتڑیاں بل کھا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ گود میں کسی نے کچھ رکھ دیا۔ یہ ایک موتی کی طرح سفید اور سیب کی طرح بڑا پھل تھا۔ ڈنڈی میں دو ہرے ہرے پتے بھی لگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ڈال سے توڑا گیا ہو۔ آہا، کیا مزہ ہے! کاش کہ اور ہوتے۔ گود بھری ہوئی تھی۔ کشتی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزر رہی تھی ایک موڑ تھا، تھوڑی دیر میں جب موڑ ختم ہوا تو یکایک دور کے ایک اونچے پہاڑ سے بجلی سے زیادہ تیز روشنی کی لپٹیں آگ کی طرح اُٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، آنکھیں چکاچوند ہو کر بند ہو گئیں۔ اندھیرا گھُپ تھا۔ ایک شور کی آواز گرج سے بھی زیادہ تیز آنے لگی صور پھُنک رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کشتی والی بیویاں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اتنے میں پھر ایک تیز روشنی ہوئی۔ سورج گر رہا تھا۔ یکایک قریب ہی سے ایک ایسی

آواز آئی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ ایک زلزلہ آگیا۔ کشتی ٹوٹ گئی اور سب دریا کے اندر ڈوب رہے تھے۔

گڑ ڑڑ ڑ! ٹپ ٹپ کی آواز چاروں طرف سے آرہی تھی۔ اماں، اماں! ابھی کانوں میں سنسناہٹ باقی تھی۔ دل گز وں اُچھل رہا تھا کیا ہے بیٹا، کیا ہے؟ ڈر لگ رہا ہے۔ یہ آواز کاہے کی تھی؟ کچھ نہیں بیٹا، گرج ہے۔ تینوں بچے چمٹے ہوئے ایک کونے میں سُکڑے پڑے تھے۔ ٹپکا ان کے لحاف تک پہنچ چکا تھا۔ مریم کی طرف کا کونا خوب بھیگ گیا تھا۔ بیچاری نے اُٹھ کر بچوں کو اور پرے سرکایا۔ اب وہ بالکل دیوار کے برابر پہنچ گئے تھے۔ یا اللہ اگر ٹپکا اسی طرح بڑھتا رہا تو اب کے بھیگنا ہی پڑے گا۔ اماں سردی لگ رہی ہے، صدیقہ اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی، اُس نے اُس کو چمٹا کے لٹا لیا۔ روئی نہیں تو دوئی ہی سہی۔ اُدھر دونوں لڑکے چمٹے پڑے تھے لپٹے ہوئے، جیسے سانپ درخت سے لپٹ جاتا ہے۔

یا اللہ رحم کر۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے، ان کی آہ سن لیتا ہے۔ کیا میں غریب بھی نہیں؟ خدا سنتا کیوں نہیں؟ ہے بھی یا نہیں؟ آخر ہے کیا؟ جو کچھ بھی ہے بڑا جلاّد ہے اور پھر بڑا بے انصاف ہے کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے، اچھی حکمت ہے کوئی جاڑے میں اینٹھیں، لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں، اوڑھنے کو کپڑے تک نہ ہوں، سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں، اور موت بھی نہ آئے۔ کوئی ہیں کہ لاکھوں والے ہیں، ہر قسم کا سامان ہے، کسی بات کی تکلیف نہیں، اگر وہ تھوڑا سا ہم کو ہی دے دیں تو ان کا کیا جائے گا؟ غریبوں کی جانیں پل جائیں گی۔ لیکن ان کو کیا پڑی کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔ ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے؟ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لیے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اٹھانے کے لیے؟ ارے

کیا انصاف ہے! وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں غریب ہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ مولوی تو یہی کہتے ہیں۔ عاقبت کس کی، بھاڑ میں جائے عاقبت تکلیف تو اب ہے، ضرورت تو اب ہے، بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہو اور دوا دس برس بعد ملے گی؟ بعض (باز — خ۔ع) آئے ایسی عاقبت سے۔ جب کی جب بھگت لیتے، اب تو کچھ ہو۔ خدا؟ محض ایک بہانہ، محض ایک دھوکا ہے۔ غربت میں غریب رہنے کی تسلّی، مایوسی میں مایوس امید، مصیبت میں تکلیف سے سے قانع رہنے کا ذریعہ۔ خدا؟ صرف ایک دھوکے کی ٹٹی۔ اور مذہب ہے کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے، یہی پڑھاتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ علم کا خزانہ ہے اور پھر افلاس کا بہانہ ہے۔ بے وقوفوں کی عقل ہے، آگے پڑھتے ہوؤں، اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے، ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ غریب رہو، غربت ہی میں خدا ملتا ہے۔ ہم نے تو پایا نہیں۔ امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلوا دیتا؟ دولت کا کیا ہوگا، صرف اتنا چاہیے کہ اوقات بسر ہو جائے، آخر امیر ہی دولت کا کیا کرتے ہیں؟ تہ خانوں میں پڑی زنگ کھاتی ہے۔ کسی خرچ کا بھی ٹھیک نہیں، جو ہے بے تُکے پن سے اٹھتا ہے، لُٹتا ہے۔ سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے۔ لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے، اُس کے تو خزانے پُر ہیں، بیٹھے بٹھلائے روپیہ مل جاتا ہے۔ اس کو کیا، موت تو ہماری ہے جب پڑے تو جانے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلبلاتا ہے۔ ابھی تو...

امّاں!

ہاں بیٹا کیا ہے؟

امّاں بھوک لگی ہے۔

بھوک! مریم کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ یا الٰہی کیا کروں! بچالے بچے...

میاں یہ بھی کوئی بھوک کا وقت ہے؟ بھوک نہ ہوئی دیوانی ہوگئی۔ سو جاؤ صبح ہوتے کھانا۔

نہیں امّاں میں تو ابھی کھاؤں گا، بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔

نہیں بیٹا، یہ کوئی وقت نہیں، لیٹ جاؤ۔ وہ دیکھو کڑک ہوئی۔ بچّہ بیچارہ کڑک کی آواز سنتے ہی سہم کر لیٹ گیا۔ کہاں سے لاؤں؟ کیا کروں؟ بارش نے تو دن بھر نکلنے بھی نہ دیا کہ کسی کے ہاں جاتی اور تھوڑا بہت جو کچھ مل سکتا لاکر سیتی، بیچاری فیاض بیگم کے بھی جانا نہ ہوا، وہ ہی بیچاری بچا کھچا جو کچھ ہوتا ہے برابر دے دیتی ہیں۔ اب جو اگر کل بھی کہیں سے کام نہ ملا تو کیا ہوگا؟ آخر کہاں تک مانگ کے لاؤں؟ دیتے دیتے بھی لوگ اُکتا جاتے ہوں گے۔

امّاں! بھوک لگی ہے، دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے، کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں آتی، کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ بیچاری آخر کو اُٹھی اور دیوے کی مدھم روشنی میں ٹٹولتی ہوئی صندوق کی طرف گئی کہ اگر کچھ مل جائے تو بچّے کو دے۔ آخر تو صرف پانچ برس کی جان ہے! کاش میں نے اِن بچّوں کو جنا ہی نہ ہوتا، میں تو مرگر کے کاٹ ہی لیتی، لیکن انکی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔ ایک سوکھی ہوئی روٹی ایک ہنڈیا میں پڑی پاگئی اس کو توڑ کر پانی میں بھگویا اور بچے کے سامنے لاکر رکھی۔ پیٹ بڑی بُری بلا ہے۔ بیچارہ کتّے کی طرح چمٹ گیا۔ تھوڑی کھانے کے بعد بولا امّاں! ذرا سا گُڑ ہو تو دے دو۔

مریم پھر کھڑی ہوگئی کہ شاید گڑ کی ڈلی بھی مل جائے۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی ڈلی پاگئی۔ بچے نے جو کچھ ہوسکا کھایا۔ دو چار نوالے جو بچے تھے مریم اپنے کو ضبط نہ کرسکی اور تھوڑا تھوڑا کرکے کھاگئی۔

کڑک اور چمک رک چکی تھی۔ بارش بھی کم ہوگئی تھی۔ پھر صدیقہ سے چمٹ کر

لیٹ گئی اور اکیلی تھی۔

آہ! کاش کہ وہ ہوتے! آہ وہ، ہوتے۔ وہ، وہ، وہ۔ رات کو آتے کچھ نہ کچھ لیے چلے آتے ہیں۔ کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے۔ وہ ہی نگوڑا پپڑی کا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی پسند ہے۔ لو! پھر چھینے لگیں دیکھا تو ہونا۔ آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ۔ کیا دن تھے، اب تو ایک خواب ہیں۔ پھر چاندنی راتوں میں پھول والوں کی سیر۔ آہ! وہ سیجیں، کیا مہک تھی دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں۔ اے کاش وہ ہوتے۔ وہ ٹانگیں، ایک سرسبز درخت، گوشت اور ہڈی اور گودے کا۔ اس کا رس خون سے زیادہ گرم؛ اور اس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم، ایک تنا شبک اور مضبوط اور دو ڈالیں اور ______

ایک تنا، ایک دوسرے میں پیوند، ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی، ایک دوسرے میں ایک دوسرے کی روح، جڑی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، ایک دوسرے کی جان، اور ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی امید، ایک پوری زندگی کا خزانہ؛ ایک لمحہ کا سرمایہ، پرنیستی میں ہستی کی طاقت، آہ! وہ ٹانگیں، دو ناگ بل کھاتے ہوئے، اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں۔ ایک سوئی کے ناکے میں تاگا اور دو انگلیاں تیز تیز چلتی ہوئی، سپاٹے بھرتی ہوئی، نرم نرم روئیں دار مخمل پر گل کاریاں کر رہی ہیں۔ ایک مکڑی اپنی جگہ قایم جالا بُن رہی ہے، اوپر نیچے ہل رہی ہے، کچھ خبر نہیں کہ مکھی جال میں پھنس چکی ہے، اور لعاب ہے کہ تار بنا جاتا ہے، جال بُنا جاتا ہے۔ ایک ڈول کوئے کی گہرائی میں لٹکا ہوا، تہ تک پہنچا ہوا، اس کے ملائم ریت کی گرمی محسوس کر رہا ہے۔

پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دائرے جو بڑھتے بڑھتے سارے میں پھیل گئے، دیواروں سے ٹکرانے لگے، باہر جانے لگے، اندر واپس آنے لگے، ایک سنسنی

اور حرارت سارے میں پھیلا رہے ہیں۔ دو جڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اُگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز، تھے کہ اُگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے، ایک ہی سوت کے پانی سے جیتے تھے۔ آہ! وہ جسم۔ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے مسل ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے۔ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی — ٹنجا، اکیلا، مرجھایا ہوا، بچھڑی کی جان ابھی تک کٹھو کریں کھانے کو زندہ ہے۔ اگر وہ ہوتے ....

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی۔

آہ! زمانہ کسی کے بہلاوے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلاوے میں نہیں آتا۔ اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں۔ اس سے تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی۔ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ۔ اُمید بھی کیا جھوٹے جھلاتی ہے۔ کبھی پاس آتی ہے، کبھی دور جاتی ہے۔

لیکن امید کاہے کی؟ اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے۔ وہ سُوت کی رسّی جھولا، چار ہم جولیاں پٹھڑے کے ایک ایک کنارے پر دو دو، اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگھور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں۔ جھولا کن نے ڈالو رے اموّریاں۔ واہ! انوری اور کشور، بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو مَیں اور گبری کتنا بڑھاتے ہیں۔ چکّر نہ آجائیں جب ہی کہنا...... پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور ...... آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے۔ باغِ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر۔ نہ وہ بیر کی ڈالی؛ کہاں میرا آشیانہ؟ پھر ایک تپتی ہوئی چٹان

بنجر اور سخت، اور اس کے پہلو سے زندگی۔ لیکن پھر اک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، من وسلوے کے مزے، دودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور اُن میں کھیلنا۔ پھر دن عید، رات شب برات۔ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ ـــــــ ابلیس اور گیہوں اور نیستی، تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا، کاش کہ وہ ہوتے ـــــ ارے آدم! ـــــ نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ پھر وہی خوشی اور خرمی۔ ایک قیامت بپا ہے۔ نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجّال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے میں تو اسی کے پاس جاؤں گی، اُمید تو ہے۔ آہ! یہ تنہائی، کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں۔ نہ تسلّی نہ تشفی نہ دلاسا۔ تنہائی، تنہائی۔ رات اندھیری اور بھیانک رات، ارے لادو کوئی جنگل مجھے........ جنگل..... مجھے........ بازا......... با..... بازار۔ مُوو۔ اُوجھ.......

رات۔

دلّی کی سیر

رشید جہاں

"اچھی بہن ہمیں بھی تو آنے دو" یہ آواز دالان میں سے آئی، اور ساتھ ہی ایک لڑکی کُرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل ریل میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ بھی فریدآباد سے چل کر دہلی ایک روز کے لیے آئی تھیں محلہ والیاں تک ان کی داستانِ سفر سننے کے لیے موجود تھیں۔

"اے ہے آنا ہے تو آؤ! میرا منہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں ہی بار تو سنا چکی ہوں۔ یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دلّی پہنچی اور وہاں ان کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب کے پاس چھوڑ یہ رفو چکّر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی بُرقعہ میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کمبخت بُرقعہ، دوسرے مردوے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں، اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پر چکّر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے، اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ! دلّی کا اسٹیشن کیا ہے بوا قلعہ بھی اتنی بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا اور ریل کی پٹریاں، انجن اور مال گاڑیاں۔ سب سے زیادہ ڈر مجھے اُن کالے کالے مردووں سے ڈر لگا

جو انجن میں رہتے ہیں۔

"انجن میں کون رہتے ہیں؟" کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بوا کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی داڑھی والا، کوئی صفاچٹ۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں دیکھنے والوں کا دل سَن سَن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دتی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کمبختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا " ذرا منہ بھی دکھا دو۔"

میں نے فوراً.......

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟" کسی نے چھیڑا۔

"اللہ اللہ کرو بوا۔ میں اِن موؤں کو منہ دکھلانے گئی تھی۔ دل بلّیوں اچھلنے لگا" تیور بدل کر" سننا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو"

ایک دم خاموشی چھاگئی۔ ایسی مزیدار باتیں فرید آباد میں کم ہوتی تھیں اور ملکہ کی باتیں سننے تو عورتیں دور دور سے آتی تھیں۔

"ہاں بوا سودے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید، لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں ٹوکرے لیے پھرتے ہیں، پان، بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلوتا ہے کھلونا، اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کیے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آکر رکی۔ وہ شور غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے، ادھر قلیوں کی چیخ پکار اُدھر سودے والے کان کھائے جاتے تھے، مسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بچاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی کی تو ٹھوکریں دھکّے کھائے ہوں گے۔ بھئی جل تو

جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی :

"ایک روپیہ لوں گا۔"

"نہیں، دو آنہ ملیں گے۔"

ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا جب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیئے اور کس لاپروا ہی سے کہتے ہیں "بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاں وریاں لادوں، کھاؤ گی؟ میں تو اُدھر ہوٹل میں کھا آیا۔"

میں نے کہا کہ "خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دو، میں باز آئی اس موئی دلّی کی سیر سے۔ تمہارے ساتھ تو کوئی جنت میں بھی نہ جائے، اچھی سیر کرانے لائے تھے۔" فرید آباد کی گاڑی تیار تھی اس میں مجھے بٹھا اور منہ پھلا لیا کہ

"تمہاری مرضی، سیر نہیں کرتیں تو نہ کرو!"

پردے کے پیچھے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

رشید جہاں

(ایک کمرہ ہے جس میں سفید فرش بچھا ہے کمرے کے بیچ
میں ایک سوزنی بچھی ہے اُس پر گاؤ تکیے سے لگی ایک بیوی بیٹھی ہیں
جو رنجیدہ اور تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں. ان کے قریب ایک چھوٹی سی
صراحی، کٹورے سے ڈھکی ہوئی تانبے کی طشتری میں رکھی ہوئی ہے۔
ان کے مقابل ایک دوسری بیوی بیٹھی ہیں جو چالیس کے قریب عمر
کی ہیں اور چھالیہ کسنے میں کاٹ رہی ہیں۔ ایک طرف ان کی پٹاری
رکھی ہے اور دوسری طرف اُگالدان۔ کمرے میں دو دروازے سامنے
ہیں اور باقی جگہوں میں طاق اور الماریاں ہیں جس میں برتن اور
سرپوش چنے ہیں۔ وسط میں چھت پر سے پنکھا ٹنگا ہوا ہے جس پر
گلابی جھالر لگی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں پلنگ، اس پر پلنگ پوش
پڑا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایک سوزنی بچھی ہے گاؤ تکیہ لگا ہے اور
اُگالدان رکھا ہے۔)

محمدی بیگم : اے ہے آپا ہمارا کیا ہے، اتنی گزر گئی، جو باقی ہے وہ بھی کسی نہ کسی
طرح گزار دے گا۔ میرا دل تو دنیا سے اب ایسا اُکتا گیا ہے اگر ان

چھوٹے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں تو زہر کھا لیتی۔

آفتاب بیگم : دیوانی ہوئی ہو بوا۔ اچھی ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو زہر کھانے لگیں! اب تو تمہارے بہار دیکھنے کے دن آئے ہیں، بچے ماشاءاللہ اب بڑے ہو رہے ہیں۔ اب چلی ہیں زہر کھانے، مجھے دیکھو.....

محمدی : تمہیں کیا دیکھوں، کوئی عمر کی بات ہے، کوئی بڈھے ہی دنیا سے تنگ آتے ہیں! ہم نے تو جتنی زندگی کی ہوس بڈھوں میں دیکھی اتنی جوانوں میں نہ دیکھی، ساری دنیا مری جا رہی ہے، نہ معلوم ہماری موت کہاں جا کر سو رہی۔ بچے وچے سب بھول جاتے ہیں اور تھوڑے دن میں سب ٹھیک......

آفتاب بیگم : ہوش میں آلڑکی ہوش میں! ابھی تمہاری عمر ہی کیا جو مرنے کی فکر سوار ہے، میرے سے تو تم دس بارہ برس چھوٹی ہو میرے بیاہ کی باتیں ہو رہی تھیں جس برس تم پیدا ہوئی ہو، اُس سال ملکہ مری تھی، مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے، اللہ بخشے چچی اماں کتنی خوش تھیں۔ میرے لیے تو بیٹا ہی ہے۔ چچی اماں کے بیاہ کے تیس برس بعد کہیں تم پیدا ہوئی تھیں۔ کھانا، ناچ رنگ اور کیا کیا ڈومنیاں آئی تھیں۔ اور تو اور، تمہارا بیاہ بھی کس ارمانوں سے ہوا ہے، ساری دلی واہ واہ بول گئی تھی۔ تمہارے برابر کون خوش قسمت ہوگا؟ مجھ دُکھیا کی طرف دیکھو، تمہارے تو اللہ رکھے میاں، بچے، گھر سب ہی کچھ ہے۔

محمدی بیگم : ہاں ٹھیک ہے! میاں، بچے، گھر، سب ہی کچھ ہے۔ جوانی! کون مجھے جوان کہے گا؟ ستر برس کی بڑھیا معلوم ہوتی ہوں، روز روز کی بیماری، روز کے حکیم ڈاکٹر، اور ہر سال بچے جننے! ہاں مجھ سے زیادہ کون خوش قسمت ہوگا۔ (یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو بھر

آئے۔ رومال سے آنسو پونچھ کر اور اُگالدان میں تھوک کر پھر شروع کیا)
ابھی دو مہینے کی بات ہے۔ پچھلا حمل گرنے سے پہلے کا ذکر ہے کہ
ڈاکٹرنی کو بلانے کی صلاح ہوئی۔ ڈاکٹر غیاث نے بھی یہی کہا
کہ اندرونی بخار کی وجہ سے بخار نہ رہتا ہو، بہتر ہے کہ ڈاکٹرنی نے اندر سے
دیکھ لے۔ لو عمر کی بات سنو: ڈاکٹرنی نے مجھ سے میری عمر پوچھی۔ میں
نے کہا ۳۲ سال۔ کچھ اس طرز سے مسکرائی جیسے کہ یقین نہ آیا میں نے
کہا "مس صاحب! آپ مسکراتی کیا ہیں! آپ کو معلوم ہو کہ ۱۱ سال
کی عمر میں میری شادی ہوئی تھی اور جب سے ہر سال میرے ہاں بچہ ہوتا
ہے سوائے ایک تو جب میرے میاں سال بھر کو ولایت گئے تھے
اور دوسرے جب میری ان کی لڑائی ہوگئی تھی اور یہ دانت
جو آپ دیکھ رہی ہیں یہ ڈاکٹر غیاث نے اکھاڑ ڈالے۔ پاریا وار
یا نہ معلوم کون بیماری ہوتی ہے وہ تھی۔ ساری بات یہ تھی کہ
ہمارے میاں جو ولایت سے آئے تو ان کو ہمارے منہ میں سے
بو آتی تھی"۔ وہ بچاری خوب ہنسی۔

آفتاب بیگم: تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو کہ سننے والے ہنسے نہ تو کیا کرے۔

محمدی بیگم: خیر، اس بچاری نے سینہ دیکھا، پیٹ دیکھا۔ جب اندر سے
دیکھا تو گھبرا کر کہنے لگی، بیگم صاحب آپ کے تو پھر دو ماہ کا حمل
معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو دل سن سے ہو گیا کہ لو اور آفت آئی۔

(اتنے میں بچوں کے رونے کی آواز دوسرے کمرے
سے آئی اور لوگوں کی چیخ پکار دوسرے کمرے میں سے سنائی
دی۔ بیگم صاحبہ گاؤ تکیہ سے اُٹھ بیٹھیں اور چیخ کر)

ارے کمبختو نہ دو منٹ، سوتے کا آرام نہ بات کرنے کی مہلت۔
اتنی حرام زادیاں بھر رہی ہیں پھر بھی بچے ہیں کہ شور مچائے

جاتے ہیں۔ اس سے تو خدا مجھے ہی غارت کر دے کہ دنیا کے
کے وبال سے چھٹوں۔

(کمرے کا دروازہ کھلا۔ دو انّائیں، صاف سے کپڑے
سوسی کے پاجامے، ململ کے کُرتے دوپٹے، دو بچوں کو روتا
ہوا لے کر داخل ہوئیں۔ کچھ بچے ان کے بڑے دروازے میں
سے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ سب بچے دُبلے اور زرد اور کمزور
تھے۔ دروازے میں سے چبوترا اور صحن نظر آتا ہے۔)

ایک انّا: بیگم صاحبہ! بڑے منّے میاں نہیں مانتے، جب کمرے میں آتے
ہیں بچوں کو ستاتے ہیں کھیلنے نہیں دیتے، اب ننّی بی کی گڑیا
اور چھوٹے میاں کی گیند لے کر بھاگ گئے اور سیدھے مردانے میں
چلے گئے، کئی بار......

محمدی بیگم: (طیش کھا کر) قصائی ہے نگوڑا قصائی! گھر میں کسی کو چین
لینے نہیں دیتا، آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔

(بچے کو گود میں لے کر پیار کیا، پٹاری میں سے
کچھ نکال کر دونوں بچوں کو کھانے کو دیا اور اس کے بعد
انّا کو واپس کر دیتی ہیں)

جاؤ خدا کے لیے اب سدھارو، صبح سے شام تک چیخ پکار! پھر ٹھہر
کر (جب نوکریں کواڑ کھلا چھوڑ دیتی ہیں)

ارے کواڑ تو بند کر دو! صبح سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں جب ادھر
سے نکلیں گی، کواڑ کھلا چھوڑ جائیں گی۔

آفتاب بیگم: بوا! تمہارے گھر میں ماشاءاللہ ہر وقت تو موا ڈاکٹر کھڑا رہتا
ہے، پھر بھی بچے دیکھو دُبلے، زرد، کمبخت، حقیر، فاقوں کے مارے
معلوم ہوتے ہیں۔

محمدی بیگم اے آپ ہی ہوں گے، جن کو ماں کا دودھ نصیب نہ ہو! انا ئیں جیسی کانی، کھُدری، موٹی، پتلی، مل گئیں، رکھ لی گئیں۔ میاں کا حکم ہے کہ جب خدا نے روپیہ دیا ہے تو تم کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ سارا مزا اپنے نفس کا ہے، کہ بچہ میرے پاس رہے گا تو خود کو تکلیف ہو گی، نہ رات دیکھیں نہ دن، بس ہر وقت بیوی چاہیے اور بیوی پر ہی کیا ہے! ادھر اُدھر جانے میں کون سے کم ہیں۔

آفتاب بیگم: محمدی بیگم تو ہر بات میں، بچارے اپنے میاں ہی کو قصور وار ٹھہراتی ہو۔ انا رکھے تو وہ بُرا نہ رکھتا تو وہ بُرا ہوتا۔ لوا اللہ اللہ کرو!

محمدی بیگم: اے ہے آپا، تم یہاں نہیں تھیں جب نصیر مرا ہے، چار مہینے کی جان جو تکلیف اس پر گزری ہے وہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے، غیروں سے نہ دیکھی جاتی تھی، اس کی انا تھی تو خاصی ہٹی کٹی، دیکھنے میں تندرست، لیکن گرمی کی بیماری تھی، اب اس کی کس کو خبر تھی، بچہ پھوٹ نکلا۔ یہ بڑے بڑے آبلے بدن پر پڑ گئے۔ اور جب وہ پھوٹیں تو کچا کچا گوشت نکل پڑے۔ جوڑ جوڑ میں پیپ پڑ گئی، تسلے بھر بھر کے انھیں ڈاکٹر غیاث نے نکالی، میں پردے کے پیچھے سے دیکھتی، دم نہ مارو، شکر گزار رو، کی مثل ہے۔ غرض کہ اسی طرح دو مہینے سڑ سڑ کر بچہ رخصت ہوا۔ اس کے بعد تین بچے ہوئے ہیں۔ کتنی مُصر ہوئی کہ میں خود دودھ پلاؤں گی، لیکن سنتا کون ہے، دھمکی یہ ہے دودھ پلاؤ گی تو میں اور بیاہ کر لوں گا، مجھے ہر وقت عورت چاہیے میں اتنا صبر نہیں کر سکتا کہ تم بچوں کی ٹہلے نویسی کرو، اور پھر تم کہتی ہو......

آفتاب بیگم: اے ہے تو یہ بات ہے! مجھے کیا معلوم۔ خدا ایسے مردوں سے بھی بچائے، جانور بھی تو کچھ خوف کرتے ہیں، یہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگئے، ایسے مردوں کے پالے تو کوئی نہ پڑے۔ ایسی باتیں بوا پہلے نہ تھیں۔ اب جس مردوئے کو سنو کمبخت کو یہی آفت ہے۔ اب تمہارے بہنوئی ہیں، خیر اب تو بڑھاپا ہے کبھی جوانی میں بھی زیادتی نہیں کی (مسکرا کر) خدا کی قسم پہروں ناک رگڑواتی تھی۔

محمدی بیگم: (ٹھنڈی سانس لے کر) اپنی اپنی قسمت ہے۔ تمہاری اس بات پر یاد آیا کہ وہ ڈاکٹرنی والی بات پوری نہیں ہوئی۔ بات کہاں کی کہاں جا پہنچتی ہے۔ جب ڈاکٹرنی نے کہا کہ میرے دو مہینہ کا پیٹ ہے، تو نہایت تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگی کہ بیگم صاحبہ! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ چار مہینے سے آپ پلنگ پر پڑی ہیں، روز شام کو بخار آتا ہے اور ڈاکٹر غیاث بھی یہی کہہ رہے تھے کہ روز شام کو ۱۰۰ یا ۱۰۱ پر بخار ہو جاتا ہے، تو آپ کا مطلب ہے کہ پھر آپ کے .... میں نے کہا کہ اے مس صاحب! تم ہی بھلی ہو، کماتی ہو، کھاتی ہو، مزے کی نیند سوتی ہو۔ یہاں تو مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ بیوی نگوڑی چاہے اچھی ہو چاہے مر رہی ہو، مردوں کو اپنے نفس سے کام ہے۔ وہ بچاری سُن کر چپ ہوگئی۔ کہنے لگی کہ آپ اتنی بیمار ہیں۔ اور بوا وہ بچاری کیا سب ہی ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ آپ کے بچے کس طرح موٹے تندرست ہوں، جب ایک تو آپ خود اتنی کمزور دوسرے بچے اتنی جلدی جلدی ہوتے ہیں۔ کیا کیا جائے اس

سے کرسٹان ہوتے تو بھلے رہتے۔

آفتاب بیگم: توبہ کرو توبہ، کفر نہ بکو! خدا ان کافروں کو مٹائے! ایک بیٹا ہے وہ بھی ایک کرسٹان کر بیٹھا ہے۔ مجھے اس کے بیاہ کے کیا کیا ارمان تھے، اب تو بھائی نے تنگ آکر وحیدہ کی منگنی کر دی، ہائے میرے دل پر کیا کیا سانپ نہ لوٹیں گے کہ میری بچپن کی مانگ غیر کے گھر جائے۔ اِس سے تو وہ ناشدنی نہ ہوا ہوتا اور میرے لیے تو مر گیا۔

محمدی بیگم: کس دل سے کوستی ہو؟ بڑھاپے کا سہارا ہے، کبھی تو ٹھیک ہو گا۔

آفتاب بیگم: اے وہ کیا ٹھیک ہو گا، دو برس ہو گئے صورت دیکھنے کو ترس گئی، شہر کے شہر میں رہتا ہے کبھی آکر جھانکتا بھی نہیں، اب تو سنا ہے کہ ڈیڑھ سو ملنے لگے ہیں، اور خدا کا یہی شکر ہے کہ اولاد ہی ابھی تک نہ ہوئی، میں تو یہی دعا مانگتی ہوں کہ آفتاب بندی چاہے تیری قبر پر چراغ جلانے والا نہ ہو لیکن اس حرامزادی، جوانا مرگ، عیسائنی کے تو بچہ نہ ہو، ہائے بوا کس سے اپنا درد کہیے سب اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں

محمدی بیگم: تم نے کچھ اور بھی سُنا، مرزا مقبول علی شاہ نے اور بیاہ کر لیا۔ دو بیویاں مر چکیں، پوتیاں نواسیاں تک بچے والیاں ہو گئیں۔ اور یہ نئی بیوی بھی کیا بھولی بھالی شکل کی ہے، جوان ہے، بالکل جوان، مشکل سے کوئی بیس برس کی ہو گی کمبخت کی قسمت پھوٹ گئی۔ ابھی تو بچاری کے چھ کنواری بہنیں اور بیٹھی ہیں، جب ہی تو بچارے ماں باپوں نے

"اتنے میں بڑے صاحبزادے، کوئی ۱۲ سال کی عمر، مٹی میں پاجامے کی مہریاں بھری ہوئی، زور سے کواڑ کھول کر بھاگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ریل دوسرے میں قینچی اور ان کے پیچھے پیچھے ایک تندرست لڑکی تنگ پاجامہ میں اور ملگجے کپڑے، دوپٹہ لٹکتا ہوا داخل ہوتی ہے۔)

لڑکی : دیکھ لیجیے اماں! یہ بڑے مرزا نہیں مانتے، یہ دیکھیے میرا نیا پاجامہ کاٹ دیا (یہ کہہ کر کُرتا اٹھا کر دکھاتی ہے) میں اِن سے بات بھی نہیں کر رہی تھی چپکی بیٹھی ابّا جان کی اچکن میں بٹن ٹانک رہی تھی، اور دیکھیے یہ دوپٹہ کا آنچل بھی پھاڑ دیا (دیوار سے لگ کھسیا کر رونے لگی۔ لڑکا بہن کی نقلیں اتارتے ہوئے)

لڑکا : اوں، اوں اوں۔ اپنی نہیں کہتیں! ہاں تم سی رہی تھیں؟ کہہ دوں اماں سے واہیات کتابیں پڑھ رہی تھیں" دلدار یار یا بانکا چھیلا" میں نے ٹھیک سے نہیں دیکھا کیا تھا۔

لڑکی : (فوراً مڑکر) خدا کے لیے اتنا جھوٹ نہ بولا کرو، خدا کی قسم اماں! میں مولوی اشرف علی صاحب کا "بہشتی زیور" پڑھ رہی تھی۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ دکھاؤ، جب میں نے نہیں دکھایا تو میرا پاجامہ کاٹ دیا، آپ کبھی انھیں کچھ نہیں کہتیں۔

محمدی بیگم (ماتھا پیٹ کر) شاباش ہے بیٹی شاباش! اماں مریں یا جئیں ہاتھ بٹانے سے تو رہیں، اور چھوٹے بہن بھائیوں سے لڑتی ہو (اور بیٹے کی طرف مڑکر) یہ موذی تو سارے دن کسی نہ کسی کو دق کرتا رہتا ہے، دفع ہو یہاں سے!

آفتاب بیگم : لاؤ میاں مجھے قینچی دے دو۔ دیکھو اپنی آپا کو کون دق کرتا ہے

وہ بچاری گئے دن کے لیے تمہارے پاس ہے، اب برس دو برس میں بیاہ ہو کر سسرال چلی جائے گی پھر صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔

(صابرہ نے اس جملہ پر فوراً شرما کر سر جھکا لیا اور چپکے سے کھسک جاتی ہے۔ بڑے مرزا گاؤ تکیے کو گھوڑا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور چند لمحہ ٹھہر کر کودنے لگتے ہیں۔)

لڑکا : تو پھر یہ ہمیں کتاب کیوں نہیں دکھاتی تھیں ؟

محمدی بیگم : اے ہے بڑے مرزا خدا کے لیے رحم کرو، اور اس طرح مجھ کو نہ ہلا ڈالو، سارا جسم ہلا دیا، کمبخت دھڑکن ہونے لگی۔ خدا کے لیے جاؤ باہر، جاؤ اپنے ابّا کے پاس اور مولوی صاحب آتے ہوں گے، سبق یاد کر لیا ؟

(سبق کا نام سن کر بڑے مرزا نے بھی چپکے سے چلے جانے میں خیریت سمجھی)

آفتاب بیگم : زیادہ بچے ہوتے ہیں، ماشاء اللہ گھر تو بھرا بھرا معلوم ہوتا ہے لیکن ہر وقت کا شور و غل بھی ناک میں دم کر دیتا ہے۔ بوا اب میں گھر میں ہوں، سارے دن کوٹے ہکتی کی طرح بیٹھی رہتی ہوں، یہ آتے ہیں نماز وماز پڑھنے، گھڑی دو گھڑی بیٹھے، بیٹھک میں چلے گئے، خدا کسی کو ایسا اکیلا بھی نہ کرے، ہائے کیا کیا ارمان تھے !

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک کولن حصہ لیے ہوئے داخل ہوتی ہے۔)

کولن : سلام بیگم صاحب سلام ! بڑی بیگم بھیجے میں تو آپ کے ہاں حصّہ لے کر جانے والی تھی۔ کہو بیگم مزاج کیسا ہے اللہ رکھے بچے کیسے ہیں؟

محمدی بیگم : ہاں بوا میں تو جیسی ہوں ویسی ہوں، کہو بھابی اچھی ہیں،
سب بچے اچھے ہیں؟ خدا پوتا مبارک کرے، پنجیری ہوگی، رحیمن
لے طشتری خالی کر دے۔ (صندوقچی کھولتے ہوئے) آپا، ایک
ٹکڑا پان کا دے دینا۔

آفتاب بیگم : رحیمن میرا حصّہ بھی یہیں لے لے۔

(یہ کہہ کر پان لگانے لگیں، محمدی نے دو آنہ کولن کو دیئے)

محمدی بیگم : سب کو بہت بہت سلام دعا کہہ دینا، کسی روز طبیعت اچھی
رہی تو آؤں گی، سب کے ملنے کو دل پھڑک گیا، بچّے کے
دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے، اور بھابی سے کہنا کہ بوا تم نے
تو آنے کی قسم کھائی ہے۔

(آفتاب نے پان دیا اور کمربند سے پیسے نکال کر دو آنے دیے)

کولن : بیگم صاحب ہماری بیوی بھی بہت یاد کرتی ہیں، فرصت
ذرا نہیں ملتی، آجکل تو خیر گھر بھرا ہے، سب ہی آئے ہوئے ہیں۔

آفتاب بیگم : سلطان دُلہن کو میری طرف سے دعا کہہ دینا اور کہنا بوا پوتا
مبارک ہو، میں جمعہ کو انشاء اللہ آؤں گی۔

(کولن رکابیاں لے کر دونوں کو سلام کر کے رخصت ہوتی ہے)

محمدی بیگم : آپا ہماری بھابی سلطان کا بھی خوب طرز ہے، اُن کے میاں
نے کبھی چالیس روپیہ سے زیادہ نہیں کمایا، لیکن وہ سلیقہ ہے
ماشاء اللہ سب کچھ کیا، بیٹوں کا بیاہ کیا، بیٹیوں کا بیاہ کیا؛
اب بیٹا خدا کے فضل سے اچھا نوکر ہو گیا ہے کوئی سوا سو کا،
آگے بڑھنے کی بھی اُمید ہے۔

آفتاب بیگم : بہو بھی اچھی ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنی اپنی قسمت ہے۔
ایک ہم ہیں۔ خیر یہ تو ہوگا۔ کہو رضیہ کی بھی کچھ خبر ہے؟ تمہارے

ماموں نے اس کا ایسے چٹ منگنی پٹ بیاہ کیا کہ کسی کو بُلایا
تک نہیں۔

محمدی بیگم: بلایا تک نہیں تو کیا ہوا، گھر گھر دوہرا تہرا کھانا بٹوایا تھا، شادی
اس غریب کی جس طرح ہوئی وہ بھی اپنی بدنامی کے ڈر سے
جلدی کر دی۔ اور اُس میں بھی خدا ان کا بھلا کرے۔

آفتاب بیگم: اے ہے یہ بات تھی مجھے تو معلوم ہی نہیں، ہاں تو پھر کیا ہوا؟

محمدی بیگم: تو تمہیں نہیں معلوم! اب تو سب ہی کو معلوم ہے، اس بچاری
کی عمر ہی کیا ہے، میری صابرہ سے دو ڈھائی سال بڑی ہے
میری شادی کے تو بعد پیدا ہوئی ہے، جب چھوٹے ماموں
کلکتہ سے آئے، برسوں بعد آئے تھے، ہم سبھی جمع تھے، نانی اماں
بچاری، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، سب سے زیادہ خوش تھیں، رضیہ
کو ئیں کچھ روز کے لیے ساتھ لے آئی، پھر چھوٹی ممانی میکے چلی
گئیں۔ لڑکی تین چار مہینے رہ گئی، رضیہ ددھیال پر جان دیتی
ہے، ننھیال سے اس کو کچھ رغبت نہیں ہے، بڑی بہن کا گھر
تھا رہ گئی تھی تو کیا ہوا میرے فرشتوں تک کو خبر نہیں۔ جب
ماں میکے سے آئیں تو رضیہ اپنے گھر چلی گئی، ایک روز رضیہ کا
پُرزہ آیا کہ آپا جانی خدا کے لیے جلدی آیئے، بس آپا کیا بتاؤں
جب وہاں پہنچی تو چھوٹی ممانی تو آپ نے دیکھی ہیں کیسی ہیں
وہ ظاہر داری کی باتیں کرتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ بہت آؤ بھگت
کی۔ رضیہ نے چپکے سے ایک پُرزہ دیا اور کہا کہ دولہا بھائی روز
ہمارے یہاں آتے ہیں۔ اور اماں بڑی خاطر مدارات کرتی ہیں
اور چپکے چپکے باتیں ہوتی رہیں۔ کنواری لڑکی اور کیا کہتی، یہ
بھی بچاری نے بڑی ہمّت کی۔ خط دیکھوں تو ہمارے میاں

کا رضیہ کے نام۔ وہ عشقیہ خط کہ نا ولوں میں بھی نہ ہو گا۔ بس میں جل
ہی تو گئی۔ رضیہ کو سمجھا کر کہ تم کچھ نہ کہو ئیں کسی سے تمہارا نام نہیں لوں گی
میں جلتی سلگتی گھر پہنچی۔ اِن سے ذکر کیا۔ اے آپا خدا کی قسم!
دیدوں میں گھس گئے، کہ کیا برائی ہے۔ اور میں تو رضیہ سے
شادی کروں گا، چاہے تمہیں طلاق ہی دینی پڑے۔ میں نے
کہا میاں، ہوش میں ہو یا بالکل ہی بے ہوش ہو! شریفوں
کی لڑکی ہے۔ اگر اُس کا نام بھی لیا تو اُس کے باپ، چچا،
بھائی تمہاری ہڈی بوٹی کر دیں گے۔ ان خیالوں میں بھی نہ
رہنا!

آفتاب بیگم: تو تمہاری ممانی نے چپکے چپکے بات پکّی کرلی ہو گی اسی لیے
تو غرّے سے کہہ رہے ہوں گے۔

محمدی بیگم: اے اور کیا۔ انھیں اللہ بخشے امّاں سے اور مجھ سے ہمیشہ کی
دشمنی ہے۔ جب امّاں بیمار تھیں تب بھی ان کے سامنے قسمیں
کھا کھا کر کہتی تھیں کہ اس وقت تک چین نہ لوں گی جب تک
محمدی کا گھر اُجڑوا نہ دیا ہو۔ اور ہم ہی پر کیا بڑی ممانی جان سے
بھی یہی بغض ہے۔ اور چونکہ رضیہ کی منگنی چچا کے ہاں ہوئی
تھی تو روز روز کی لڑائی تھی کہ دشمنوں میں بیٹی نہ دوں گی۔

آفتاب بیگم: (ہنس کر) اور بوا تمہارے میاں ہی میں کیا رکھا تھا! بیوی
والا، بچّوں والا، ہاں روپیہ ہے۔ تو تمہارے بڑے ماموں
بھی غریب نہ تھے کہیں شریفوں میں بھی ایسی باتیں ہوئی
ہیں۔ موئے پنجابیوں میں، دو بہنیں اپنی بیٹیاں ایک مرد
کو بیاہ دیں تو بیاہ دیں، ہمارے ہاں تو ایسا ہوتا نہیں۔
اب نیا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟

محمدی بیگم: جب میں بگڑی اور صلواتیں سنائیں تو خوشامد کرنے لگے کہ میں
اس پر عاشق ہوگیا ہوں۔ ہائے خدا کے لیے میری مدد کرو۔ میری
مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ قرآن شریف کھول کر بیٹھ جائیں اور
آئتیں پڑھیں کہ میں ان کی مدد نہ کروں گی تو بعد مرنے کے یہ
ہوگا وہ ہوگا۔ اب اس سے زیادہ کون سی آگ ہوگی؟ یہ ہر وقت
کا جلنا، غرض کہ ہر وقت کی یہی باتیں کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔
کمرا بند کیے منہ اوندھائے پڑے ہیں۔ رضیہ، ہائے رضیہ ہو رہی ہے
میں پڑی سب سُن رہی ہوں۔ خدا کی قسم آپا اِس قدر کلیجہ پک
گیا ہے کہ یہ روپیہ پیسہ اب تو مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ روکھی
روٹی ہو اور سُکھ ہو۔ آپا ذرا ایک پان دینا باتیں کرتے کرتے
ہونٹ سوکھ گئے۔

(پاس صراحی رکھی تھی اُس میں سے پانی نکال کر
پیا، آفتاب نے پان کھایا اور محمدی کو بھی دیا۔)

غرض کہ یہی حالت جاری رہی اور وہ عشقیہ لفظ اس معصوم کنواری
بچی کے لیے استعمال کریں، اور میں سب سُنوں اور دل میں
گھٹوں، اور چھوٹی ممانی ہیں کہ وہی سلوک وہی خاطر۔ رضیہ
تمہارے دولہا بھائی آئے ہیں، پان دو، الائچی دو۔

آفتاب بیگم: اچھا تو یہ کہو کہ سب کچھ کیا دھرا تمہاری ممانی ہی کا تھا۔

محمدی بیگم: اور کیا! وہ لڑکی گھنٹوں روئے، کہیں میں مل جاؤں تو دل کا
بخار نکال لے۔ ایک مہینہ تو میں چپ رہی پھر ایک دن دونوں
ماموں مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے کہا کیوں ماموں جان کیا رضیہ
کی منگنی چھٹ گئی؟ دونوں بھائی چکرا گئے۔ پھر میں بھری بیٹھی
تھی میں نے سب کچّا چٹھا کہہ ڈالا۔ دونوں میں کچھ صلاح ہوئی

ہو گئی، تیسرے دن رضیہ کا بیاہ ہو گیا۔

آفتاب بیگم: اللہ اللہ خیر صلا!

محمدی بیگم: لیکن بوا چھ مہینے یہ گھر میں نہیں گھسے، ہر وقت چاوڑی میں پڑے رہتے تھے، اور میں تو خوش تھی، اللہ گواہ ہے جس روز یہ اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں تو میں چین کی نیند سوتی ہوں، روز یہی ہے کہ تم تو روز روز کی بیمار ہوئیں کب تک صبر کروں، میں دوسرا بیاہ کرتا ہوں، اور پھر یہ ضد ہے کہ تم میرا بیاہ کراؤ شرع میں چار بیویاں جائز ہیں تو میں کیوں نہ کروں، میں نے تو کہا بسم اللہ کرو، اب سال بھر بعد صابرہ کی رخصت ہے، باوا بیٹوں کا ساتھ ساتھ ہو جائے، ایک گود میں نواسا کھلانا دوسری میں نئی بیوی کا بچہ۔ بس لڑنے لگتے ہیں کہ عورتیں کیا جانیں خدا نے اِن کو حس ہی نہیں دی۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم میں سارے مردوں کی حس بھری ہوئی ہے اب کیا.......

آفتاب بیگم: (ٹھوک کر) محمدی بیگم! جہاں دیکھو یہی آفت آئی ہوئی ہے۔ مردوں نے تو وہ گڑھ جیتا ہے کہ اُٹ بھی ماریں پٹ بھی ماریں اب یہ ظلم ہے یا نہیں کہ بیاہ بھی کروں گا اور یہ بھی بیوی ہی کمبخت.......

محمدی بیگم: اِسی سے تو میں جل جل کر اپنے مرنے کی دعا مانگتی ہوں۔ ایک تو ہر وقت کی اپنی بیماری، روز روز کا بچوں کا رنجھنا الگ۔ خیر بڑے بچے تو ماشاء اللہ خاصے تندرست ہیں ہاں یہ چھوٹے بچے آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ اِن سب باتوں نے اب جینے کا لطف تو بالکل کھو دیا، اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ دوسرا

بیاہ کریں اور پرکریں، یہ ہر وقت کا دھڑکا الگ۔ خدا اس سے پہلے تو مجھے اٹھالے کہ میں سوکن کا منہ دیکھوں، اور سوکن کے ڈر سے بوا میں نے کیا کیا نہ کیا، دو دفعہ آپریشن بھی کروایا۔

اُفتاب بیگم: اے ہاں ہم نے تو سنا تھا کہ تم نے کچھ ایسا کروالیا ہے کہ اب تمہارے ہاں بچے نہ ہوں گے۔

محمدی بیگم: یہ تم سے کس نے کہا؟ اصل بات یہ تھی کہ رحم اور نیچے کا سارا جسم جھک آیا تھا تو اس کو ٹھیک کروایا گیا تھا کہ پھر سے میاں کو نئی بیوی کا لطف آئے۔ اے بوا جس عورت کے ہر سال بچے ہوں اس کا بدن کب تک ٹھیک رہے گا؟ پھر کھسک گیا، پھر میرے پیچھے پڑ کر ڈرا دھمکا کر مجھے ذبح کروایا اور پھر بھی خوش نہیں ہیں۔

(اذان کی آواز پاس کی مسجد سے آتی ہے۔)

اُفتاب بیگم: اے ہے بوا ظہر کا وقت ہوگیا، باتوں میں ایسی مشغول ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی (کسنا باندھتے ہوئے) اب نماز پڑھ کے ہی جاؤں گی، تمہارے بھائی بچارے انتظار کررہے ہوں گے۔

محمدی بیگم اے آپا آج تم آگئیں تو اتنا دل کا بخار بھی نکل گیا، ذرا جلدی جلدی ہوجایا کرو، میں تو بیمار ہوں نہ کہیں آنے کی رہی نہ جانے کی۔ اے رحیمن! رحیمیں!! گل شبو!

(رحیمن آتی ہے)

جا، بڑی بیگم صاحب کو وضو کروا اور صحنچی میں چوکی پر جانماز بچھادے۔

پردہ

جوانمردی

محمود الظفر

وہ میری بیوی جا رہی، مگر اس کے لبوں پر اس مسکراہٹ کا نام تک نہیں جیسا کہ لوگوں نے میری تسکین قلب کے لیے مجھ سے کہا تھا بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے۔ اس کی بھیانک صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مہلک بیماری کا شکار رہے اور موت کا خوف اس پر طاری رہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے اب لطف اور پیار کی جگہ بیگانگی اور نفرت ہے، میں مستحق ہی اس کا تھا۔ اس نفرت کی وجہ، وہ نا زائیدہ بچّہ ہے جس کا سر اس کے کولے کی ہڈیوں میں اب تک پھنسا دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ یہ بھلا کسے خیال ہو سکتا تھا کہ میری بیوی کو مرتے وقت مجھ سے نفرت ہوگی۔ میں نے اس کو تکلیف اور موت سے بچانے کے لیے کون سی بات اٹھا رکھی تھی، مگر نہیں۔ میں ہی اس کی موت کا باعث ہوا، میں نے ہی اس کو درد اور دکھ پہنچایا، مردوں کی جہالت اور حماقت کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر یہ بھی کہنا صحیح نہیں کہ میں جہالت اور حماقت کا شکار تھا۔ ہاں یہ سراسر غلط ہے۔ دراصل میں غرور کے پنجہ میں گرفتار تھا جس کا مجھے اعتراف ہے۔

ہماری شادی ایسی عمر میں ہوئی تھی جب ہم میں ایک دوسرے کے جذبات سمجھنے کی صلاحیت تک نہ تھی۔ لیکن بعد میں جو حادثہ پیش آیا

اس کا الزام میں قسمت، یا ایسے حالات پر جن پر مجھے کوئی قابو نہ تھا، نہیں رکھنا چاہتا۔

مجھے اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیسے؟ ہم دو مختلف دائرہ زندگی میں گرداں تھے۔ میری بیوی پرانے زمانے کی تنگ و تاریک گلیوں میں اور میں نئے زمانے کی صاف اور چوڑی پکی سڑکوں پر۔ لیکن جب میں دوسرے ملکوں میں گیا اور اس سے کئی برس تک جدا رہا تو کبھی کبھی میرا دل اس کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے مستحکم پرانے قلعہ میں تھی، اور میں زندگی کی دوا دوش فضول اور بے فیض عشق بازی سے تنگ آکر کبھی کبھی اس پاک و باوفا عورت کا خواب دیکھا کرتا تھا جو بلا کسی معاوضہ کے مجھ پر سے سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار تھی۔ جب میری یہ کیفیت ہوتی --- تو بیتابی کے ساتھ مجھے اس سے ملنے کی خواہش ہوتی۔ ایک دفعہ مجھ پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی کہ مجھے اس کا ایک خط ملا۔ میں بیقرار ہوگیا اور فوراً چھ ہزار میل کے فاصلے سے وطن کی طرف چل پڑا۔ اس نے خط میں لکھا تھا:

"میں نے ابھی تکیہ کے نیچے سے پھر آپ کا خط نکال کر پڑھا۔ بہت مختصر ہے۔ غالباً آپ اپنے میں مشغول ہوں گے، مگر خیر مجھے اس کی کوئی شکایت نہیں، بس آپ کی مجھے خیریت معلوم ہوتی رہے اور آپ اچھے رہیں اور خوش رہیں، میرے لیے یہی کافی ہے۔ جب سے میں بیمار ہوں سوائے اس کے کہ آپ کو یاد کروں اور ان عجیب عجیب چیزوں اور نئے نئے لوگوں کا خیال کروں جن سے آپ وہاں ملتے ہوں گے مجھے اور کام نہیں، مجھ سے چلا نہیں جاتا اس وجہ سے پلنگ پر پڑی پڑی طرح طرح کے خیال کیا کرتی ہوں۔ کبھی تو اس میں لطف آتا ہے اور کبھی اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے، جب لوگ میری صحت کے بارے میں گفتگو

کرتے ہیں اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور یہ نصیحت کرتے ہیں تو
مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے، یہ لوگ یہ تک نہیں سمجھتے کہ مجھے کیا روگ ہے۔
انھیں صرف اپنی تسکینِ قلب کے لیے میری حالت پر رحم آتا ہے۔ اپنے
والدین پر بھی بار ہوں، وہ اپنے جی میں خیال کرتے ہوں گے کہ باوجود میری
شادی ہو جانے کے میں ایسی بدنصیب ہوں کہ ان کے گلے پڑی ہوں۔ اس
کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر وقت اس کوشش میں رہتی ہوں کہ بہت زیادہ
مایوسی اور رنج کا اظہار نہ کروں اور میرے والدین ایسی کوشش کرتے
ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں میری بیماری کی وجہ سے بڑا تردّد
اور فکر ہے۔ غرض دونوں طرف بناوٹ ہی بناوٹ ہے۔ میں آپ سے کسی
بات کی شکایت کرنا نہیں چاہتی اور نہ آپ کے کام میں ہارج ہونا چاہتی
ہوں۔ آپ مجھے بھول نہ جائیں اور کبھی کبھی خط لکھ دیا کریں، میرے لیے یہی
بہت ہے بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ کا مجھ سے دور ہی رہنا
بہتر ہے۔ مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ جیسے بیماری کے بعد سے یہاں میں قریب
قریب سب سے ناآشنا سی ہو گئی ہوں ویسے ہی میں کہیں آپ کو بھی نہ
کھو بیٹھوں۔ دن رات میری بُری حالت دیکھ کر کہیں آپ کا دل بھی میری
طرف سے نہ ہٹ جائے۔ وہاں سے تو آپ محض اس کا تصور کر سکتے ہیں
اور میں آپ کو اپنا وہ کامل دمساز تصور کر سکتی ہوں جس کی میرے دل
کو تمنّا ہے۔"

جب مجھے یہ خط ملا تو مجھ پر عشق و محبت کی ایک لہر سی دوڑ گئی، گو
کہ وہ بیمار تھی اور اسے روگ لگ گیا تھا مگر اس کو سینے سے لگانا میرا فرض
تھا، میں یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ میری محبت میں کوئی بات حائل
نہیں ہو سکتی، میں چاہتا تھا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ میں ہی وہ کامل
دمساز ہوں جس کی اسے جستجو تھی، میں نے اپنے کو قصوروار اور بُرا قرار دیا

اور اس کو معصوم اور نرمل، جیسی اس نے میرے ساتھ خاکساری برتی اور میری خدمت گزاری کی، میرا بھی فرض تھا کہ میں اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں۔ یہ تہیہ کر کے میں اپنا کام چھوڑ کر گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

میں ابھی راستے ہی میں تھا کہ میرے جذبات میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ شروع کا سا پاک جذبہ بالکل غائب ہوگیا اور روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف میرے خیالات دوڑنے لگے، مثلاً روزی کمانے کی میں کون صورت نکالونگا اپنے دوستوں میں سے کن کن سے ملاقات جاری رکھوں گا۔ اپنے سُسر اور ساس سے کس طرح ملوں گا، ان سے صاف صاف باتیں کروں یا یہ کہ ان کی طرف سے بیرخی برتوں، وغیرہ وغیرہ۔ صرف اپنی بیوی سے ملنے کی پہلے کی سی تمنّا باقی نہ رہی، یہ ہی نہیں بلکہ ذرا ذرا سے روزانہ زندگی کے مسئلوں نے میری تمنّاؤں اور ولولوں کا خاتمہ کر دیا۔ گھر پہنچنے پر یہ مسائل مکروہ حقیقتوں سے بدل گئے جن سے گریز نا ممکن تھا۔ پرانے زمانے کی جن جن دلفریبوں کی میں نے اپنے ذہن میں تصویر کھینچی تھی ان کا کہیں پتہ بھی نہ تھا بجائے اس کے میں نے خود کو ایک تنگ و تاریک، گندی، ظلم اور جہل سے لبریز دنیا میں بند پایا، اسٹیشن پر جو لوگ مجھ سے ملنے آئے ان میں اکثر بیہودہ، بدمعاش، تنگ نظر اور ناکارہ قسم کے آدمی تھے، اُن سب نے بہت خوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا، مجھے بٹھایا گیا، مجھ پر فقرے کسے گئے، وہی پرانے ناشائستہ مذاق ہوئے اور دوسروں کی عیب جوئی کی گئی کئی دن تک جلسوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد کہیں ان لوگوں سے نجات ملی۔ اس درمیان میں مَیں اپنی بیوی سے صرف تھوڑی دیر کے لیے مل سکا لیکن اس کے تیل سے چپکے ہوئے بال، اس کا لاغر جسم اور زرد چہرہ؛ دعوتوں، رقص وسرود کے جلسوں اور ادھر اُدھر بات چیت کے وقت بھی بار بار میری نظر کے سامنے آجاتا تھا۔

جب سب مہمان رخصت ہوگئے تو میں اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس کے قریب پلنگ پر جاکر بیٹھا۔ وہ ساکت لیٹی رہی اور میری طرف اس نے نظر اٹھاکر نہیں دیکھا۔ میں تھوڑی دیر تک تو اس کی ہر سانس کے ساتھ اس کے سینہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں بولا:

"لیجیے اب تو میں آپ کے پاس آگیا، کچھ باتیں کیجیے، آپ اتنی چپ کیوں ہیں؟"

اس نے جواب دیا "میں کیا باتیں کروں، خیر آپ آگئے۔"

میں نے دفعتاً یہ محسوس کیا کہ اس طرح کام نہیں چلنے کا۔ میں نے شروع میں جو تہیہ کیا تھا وہ مجھے یاد آگیا اور میں نے جلدی سے کہا:

"واہ، آپ کو کہنا تو مجھ سے بہت کچھ ہے، اتنے دن جو میں یہاں نہیں رہا تو آپ کیا کرتی رہیں اور کیسی رہیں سب مجھے بتائیے، آخر اتنے دن تک آپ نے مجھ سے بات چیت نہیں کی اب اس کی کسر نکالیے، یاد ہے آپ کو آپ نے مجھے ایک دفعہ خط میں لکھا تھا کہ آپ کو ایک ہمدم و دمساز کی جستجو ہے۔ میں ہی وہ شخص ہوں اور اب آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں اور کبھی آپ سے جدا نہ ہوں۔"

مگر میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ میری باتوں سے ظاہر تھا کہ رٹے ہوئے سبق کی طرح اوپری ہیں اور ان سے میری بیوی کی کوئی تسلّی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک مجھے یہ امید رہی کہ اُسے اِس کا شاید احساس نہیں ہوا۔ مگر وہ گھبراہٹ اور بے چینی سے میری ٹوپی اٹھاکر ہاتھوں سے ملنے دلنے لگی اور پھر ایسی گفتگو شروع کی کہ مجھے اپنی ناکامیابی کا یقین ہوگیا۔

اس نے کہا "بھلا میں کیا کہوں؟ یہاں تو جیسے دن ویسی رات لیکن آپ کیوں چپ ہیں؟ آپ کو نئے نئے تجربے ہوئے ہوں گے، اہم امور سے

سابقہ پڑا ہوگا۔ آپ مجھ سے ان سب باتوں کا تذکرہ کیجیے، وہاں کی عجیب عجیب چیزیں، طرح طرح کی مشین، قسم قسم کے لوگ، نئی زندگی، آپ لکھا کرتے کہ آپ کو ان سب کے بارے میں مجھے لکھنے کا وقت نہیں، لیکن اب تو آپ میرے پاس ہیں، اب تو آپ کو وقت ہے"۔

یہ اس نے جان کر میری خود بینی پر حملہ کیا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ برسوں کی جدائی نے ہمارے تعلقات میں مطلقاً کوئی فرق پیدا نہیں کیا ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک دوسرے سے ناآشنا تھے اور ایک دریا کے دو مختلف کناروں پر اجنبی کی طرح کھڑے ہوئے تھے، ہم نے پھر ایک دوسرے کے ساتھ ریاکاری شروع کر دی۔

میں نے کہا "ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، ہم دونوں مل کر کیا کیا کریں گے، یہ طے کرنا ہے۔ لیکن پہلے آپ جلدی سے اچھی تو ہو جائیے، جب آپ اچھی ہو جائیں گی تب ہم اس کے بارے میں گفتگو کریں گے، ابھی تو آپ کو خاموشی سے آرام کرنا چاہیے، آپ اپنے دل و دماغ پر زور نہ ڈالیے، میرے آنے کی وجہ سے غالباً آپ کو تکان ہوگیا آپ آرام کیجیے اور زیادہ سوچیے مت، اچھا میں اب جاتا ہوں آپ سو جائیے"۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

اس کے بعد نہ تو میں نے اس سے زیادہ رابطہ بڑھانے کی کوشش کی اور نہ کسی خاص بات پر زیادہ دیر تک گفتگو ہی کی۔ دن میں ایک دو دفعہ اسے دیکھنے جایا کرتا، دریافت کرتا کہ اس کی صحت کیسی ہے اور ایسی ہی دو ایک باتیں کر کے چلا آتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اتفاق سے میرا کام بھی ان دنوں کچھ اچھا نہیں چل رہا تھا اور مجھے فرصت کافی تھی۔

رفتہ رفتہ میں پھر اپنے پرانے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگا اور ان کی لغو اور فضول عادتیں مجھ میں بھی آگئیں۔ تاش، شراب اور بے سر و پا

باتوں کا سلسلہ جاری رہنے لگا۔ ہم اپنے کو موسیقی کا بھی ماہر سمجھتے تھے اور شہر کی نامور گانے والیوں کے سرپرست بن بیٹھے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں نے ایک عورت بھی رکھ لی تھی۔ ہم نے بے معنی اور بے مقصد زندگی بسر کرنے کی یہی ترکیبیں نکالی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ غیر ممالک کا سفر کر آئے تھے وہ اپنی جواں مردی اور عاشقی کی داستانیں دوسروں کو سنا سنا کر ان پر رعب جماتے تھے۔

لیکن مجھے اپنی بیوی سے چھٹکارا پانا ناممکن تھا۔ اس کی صحت کی خرابی کی وجہ سے میرے پاس مزاج پرسی کے لیے خطوط اور دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک سلسلہ قایم رہتا۔ کوئی مجھے نصیحت کرتا تو کوئی فضیحت، کوئی دلاسا دیتا تو کوئی اظہار ہمدردی کرتا، اِن سب باتوں سے میری زندگی عذاب ہوگئی۔ میرے ساس اور سسر کو میری آزادہ روی بہت کھلتی تھی، وہ ڈرتے تھے کہ کہیں میں ان کی لڑکی کو بالکل چھوڑ نہ دوں۔ اِدھر میری والدہ صبح شام مجھ سے دوسری شادی کر لینے پر مُصر تھیں۔ خاندان میں دو ایسے گروہ بن گئے جنھیں ایک دوسرے سے سخت عداوت تھی۔ دونوں مجھے اپنی طرف کھینچنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہتے تھے۔

لیکن باوجود والدہ کے اصرار کے میں دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ آخر کار لوگوں نے میری مردانگی پر شک کرنا شروع کیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اس پر تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔

میں اپنی سسرال گیا اور وہاں جا کر کہا:

"آپ کی لڑکی بیمار و یمار کچھ بھی نہیں، یہ سب خواہ مخواہ اسے اپنے یہاں روکنے کے بہانے ہیں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔"

اپنی بیوی سے بھی میں نے کہا:

”آپ بالکل بیمار نہیں، کم از کم ایسی بیمار نہیں جیسا یہاں لوگ آپ کو بنانا چاہتے ہیں، یہ سب آپ کے والدین کی چال ہے، یہ بات کچھ آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے، آپ میرے ساتھ چل کر رہیئے تب پتہ چلے گا کہ آپ کو کیا بیماری ہے۔“

پہلے تو میری صاف گوئی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر تھوڑی بہت تکرار کے بعد وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئی۔

ہم دونوں نے ایک لمبا سفر کیا، اور دور پہاڑوں پر جا کر رہنے لگے برفستان کی خشک اور تازہ ہوا میں دور دور ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔

جب تھوڑے دنوں بعد میری بیوی کی صحت ٹھیک ہوگئی تو میں اسے لے کر گھر آیا۔ میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے جب ہمیں دیکھا تو میرے لیے یہ بڑے فخر کا موقع تھا۔ مگر ان کے دلوں میں شک باقی رہ گیا وہ پورے ثبوت کے لیے کسی اور چیز کے خواہاں تھے۔ لیکن مجھے اپنی فتحیابی کا پورا یقین تھا۔ ایک مہینے کے بعد دوسرا مہینہ آہستہ آہستہ گزرتا جاتا تھا اور میری بیوی کا پیٹ بڑھتا جاتا تھا۔

میری حالت اس مالی کی سی تھی جو اپنے لگائے ہوئے درختوں پر کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے۔ ہر ہر دن، ہر ہر لمحہ کے بعد میری کامیابی زیادہ نمایاں ہوتی جاتی۔ لیکن میری بیوی خاموش رہتی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا سبب غالباً زچگی کی گھبراہٹ اور پریشانی ہے۔

آخرکار اس کو دردِ زہ شروع ہوا۔ گھنٹوں تک کرب اور بے چینی کا عالم رہا۔ جسم شدتِ تکلیف سے تڑپ رہا تھا اور کسی پہلو اسے چین نہیں تھا۔ روح تک معلوم ہوتا تھا کہ آہ و فریاد کر رہی ہے۔ لیکن اس کی بیکلی اور تڑپ، اس کی آہ و زاری ان سب سے میری جواں مردی کا ثبوت مل رہا تھا۔

معاذاللہ! میرے کانوں میں ابھی تک اس کا دردناک کراہنا گونج رہا ہے۔ اور اس کے بعد چاروں طرف جو خاموشی چھا گئی اور جس نے میری اکڑ اور شان کو خاک میں ملا دیا، وہ سماں بھی ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد جب لوگ مجھ سے یہ کہنے آئے کہ مرتے وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی تو میرے دل کو کچھ سکون ہو گیا۔

مصنّف کی دیگر تصانیف

- "انگارے کا تاریخی پسِ منظر اور ترقی پسند تحریک"
- "انگارے"
- "میر کے جنسی کے ردیئے"
- "بازیافت" تنقیدی و تحقیقی مضامین
- "وَحی" مجموعۂ کلام (زیرِ طبع)
- "غزل کے جدید رجحانات" تحقیقی مقالہ (زیرِ طبع)
- "ہندی غزل" تحقیقی مقالہ (زیرِ طبع)
- "اصطلاحاتِ ذوق" فرہنگ قصائد ذوق
- "مشک" غزلوں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

مصنّف کی دیگر تصانیف

- "انگارے کا تاریخی پسِ منظر اور ترقی پسند تحریک"
- "انگارے"
- "میر کے جنسی کے ردیئے"
- "بازیافت" تنقیدی و تحقیقی مضامین
- "وَحی" مجموعۂ کلام (زیرِ طبع)
- "غزل کے جدید رجحانات" تحقیقی مقالہ
- "ہندی غزل" تحقیقی مقالہ (زیرِ طبع)
- "اصطلاحاتِ ذوق" فرہنگ قصائد ذوق
- "مشک" غزلوں کا مجموعہ (زیرِ طبع)